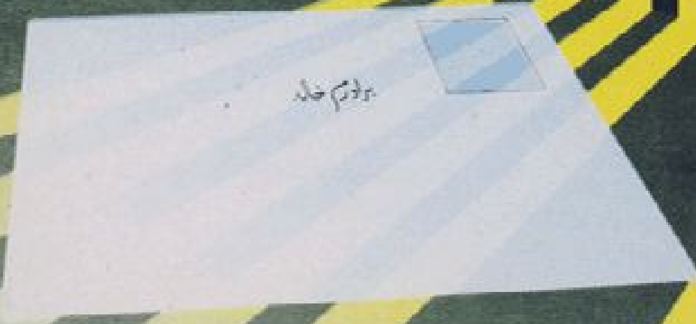
خالد کے نام



ظفر جمال بلوچ

ادارہ مطبوعات طلبہ

١۔ اے ذیلدار پارک لاہور

کتاب .... خالد کے نام

مصنف .... ظفر جمال بلوچ

ناشر .... قیصر شریف (مینیجنگ ڈائریکٹر)

ٹائٹل ڈیزائن .... ساجد بلال

پرنٹرز .... میٹرو پرنٹرز

تعداد اشاعت 2100

تاریخ اشاعت .... اپریل 2008ء

قیمت .... 18 روپے



ادارہ مطبوعاتِ طلبہ

قائم شدہ 1962ء 1۔اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور۔فون: 7553991

پہلی بات

"خالد کے نام" ان خوبصورت خطوط کا مجموعہ ہے جو ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان ظفر جمال بلوچ بھائی نے اپنے بچپن کے ایک دوست کو جواباً" تحریر کئے۔ جذبوں کو جواں اور حوصلوں کو توانا رکھنے والے یہ خطوط داعی اسلام کو کامل یکسوئی اور یقین محکم کی دولت سے نوازتے ہیں۔ ان خطوط میں جمعیت کی دعوت اور پروگرام کا دلنشین پیرائے میں تفصیلی ذکر موجود ہے۔ دنیا کی چلملاہٹ سے بے نیاز' طعنوں اور دھمکیوں اور جھوٹی سزاؤں کے تند و تیز تیروں کے حملوں کے باوجود اللہ کی کبریائی بلند کرتے ہوئے ایک دوست زنداں کی تاریک کوٹھڑی سے کس طرح اپنے دوست کو اسلام کی دعوت پیش کرتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے۔

ظفر بھائی نے یہ خطوط 1974ء میں ناموس رسالتؐ کے تحفظ میں اسلامی جمیعت طلبہ کی طرف سے قادیانیوں کے خلاف چلائی جانے والی "تحریک ختم نبوتؐ" کے دوران جیل سے تحریر کئے۔ یہ خطوط داعی کے دل میں موجود و مطلوب وہ آگ ہے جس کی آنچ سے ہم اپنے اردگرد کے ماحول کو گرم رکھنا اور منور کرنا چاہتے ہیں۔

قیصر شریف

مہتمم ادارہ مطبوعات طلبہ' لاہور

انتساب

تسنیم عالم منظر شہید کے نام
جو میرے بھائی
دوست
اور
ناظم اعلیٰ تھے۔

بسم اللہ الرحمان الرحیم

برادر عزیز!

آپ پر خدا کی سلامتی ہو۔ ایک طویل ترین وقفہ کے بعد آپ کا خط موصول ہوا' خط پڑھتے ہی میں اپنے ماضی میں کھو گیا' وہ ماضی جو ۵۔ ۶ سال پر محیط ہے' جب ہم دونوں دسویں کے طالب علم تھے۔ محفلیں جمتی تھیں' تقریری مقابلے ہوتے تھے' دعوتیں دی اور لی جاتی تھیں۔ وقت تھا خوب گزر گیا' آج بھی جب مجھے اس دور کے واقعات یاد آتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر وہی دور لوٹ آئے' وہ دور جس میں خلوص کی فراوانی تھی' جہاں پاکیزگی تھی؛ سادگی تھی اور اخلاص و محبت کا ماحول تھا' جہاں اونچ نیچ کی دیواریں قائم نہ تھیں' جہاں استاد حقیقتاً استاد نظر آتے تھے۔ اس دور کا تقدس موجودہ ماحول کے اندھیرے میں مزید نکھر چکا ہے۔ کہاں وہ دور جہاں پاکیزگی ہی پاکیزگی تھی اور کہاں یہ دور کہ ہر طرف جیب کترے ہی نظر آتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے غافل ہوئے نہیں کہ پونجی لٹ گئی۔ کاروباری باتیں کاروباری خلوص اور مشینی انداز یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم انسانوں کی بستی سے نکل کر پتھروں اور بتوں کی وادی میں آگئے ہیں لیکن دوست پتھروں اور بتوں کی وادی میں ہی سکوت ہوتا ہے' موت کا سناٹا اور ویران پہاڑ دیکھتے ہیں لیکن حرکت نہیں کر سکتے' ان کے ہاتھوں سے دامن دل ونظر تو تار تار نہیں ہوتے۔ یہاں تو ہمارے اردگرد چیرنے پھاڑنے کا عمل جاری ہے۔ خون بہہ رہا ہے خون انسان کی ارزانی بھی ہے اور فراوانی بھی' انسان دم توڑ رہا ہے' لیکن وحشی قہقہے ہیں کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتے' سوچتا ہوں کہ غلطی سے کہیں درندوں کی حدود سلطنت میں تو قدم نہیں رکھ دیا۔ آپ نے مجھے خط لکھ کر ماضی کو دوبارہ یاد کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ماضی جسے بھولنے کی سعی ناتمام کر چکا ہوں' اس لئے نہیں کہ مجھے ماضی سے محبت نہیں میرے لئے اصل کشش ماضی میں ہی ہے' میرا حال جو کچھ بھی ہے' یہ اس ماضی کا مرہونِ منت ہے' میں بیسیوں صدمات سہنے کے باوجود بھی اگر ابھی تک لڑکھڑایا نہیں تو اس کی وجہ ماضی کی تربیت ہے اور دریائے زندگی سے گزرنے اور اس میں غوطے کھانے کے باوجود اگر آج تک دامن داغدار نہیں ہوا تو محض اس لئے کہ ماضی نے میری حفاظت کی تھی۔ میں اگر ماضی کو بھولنا چاہتا تھا تو اس

لئے کہ اسے یاد رکھنے کی صورت میں کہیں حال سے برگشتہ نہ ہو جاؤں' کہیں ہمت نہ ہار بیٹھوں' اور کہیں حال کی تلخیوں اور اذیتوں کا دیو میرے وجود کو نگل ہی نہ لے۔ یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مایوسی کی صورت میں منزل مقصود پر کبھی نہیں پہنچا جا سکتا' میں منزل پر پہنچنا چاہتا ہوں' میری خواہش ہے کہ زمانہ سے پنجہ آزمائی کا سلسلہ جاری رہے' اور حال میں اس حد تک جدوجہد کی جائے کہ مستقبل اپنی پسند کے مطابق ہو۔ اس لئے بھی اسے بھولنا چاہتا تھا کہ کہیں اسے یاد رکھنے کی صورت میں ماضی کی چھاؤں میں پناہ لینے کی کوشش نہ کروں۔ وہ ماضی جو فی الحال تصوراتی ہے اس کی یادوں میں گم رہنا کہیں مجھے فرار کی راہ پر گامزن نہ کر دے اور فرار موت کا دوسرا نام ہے۔ میں اذیت' بے بسی اور بے کسی کی موت مرنا نہیں چاہتا۔

میں آپ کو تصورات ہی تصورات میں اپنے ساتھ کلاس میں سبق پڑھتے دیکھ رہا ہوں' بھولی بھالی صورت' من موہنی باتیں اور پاکیزہ سوچ آپ کو یاد ہی ہو گا کہ ہم دونوں نے مستقبل کے بارے میں نجانے کتنے حسین خواب دیکھے تھے۔ دونوں نے طے کیا تھا کہ ڈاکٹر بن کر انسانوں کی خدمت کریں گے' ماحول کی برائیوں کو دور کریں گے اور مریضوں کی جیبوں پہ ہاتھ رکھنے کے بجائے مریضوں کی ڈوبتی نبضوں پر ہاتھ رکھیں گے۔ اور پھر یوں ہوا کہ امتحان سے قبل آپ کو والد کے تبادلہ کی بناء پر جانا پڑا' رخصت ہوتے وقت آپ کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن آپ نے ضبط کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں زمین پر گرنے کی اجازت ہی نہ دی۔ آنسوؤں کے موتیوں کو گرنے دیتے تو شاید دل کے دھوئیں میں کچھ کمی آجاتی' میں آپ سے کچھ بھی تو نہ کہہ سکا' یہ الگ بات ہے کہ دل کی دنیا ماتم کدے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ آپ کے جانے کے بعد کلاس میں وہ پہلی سی رونق نہ رہی۔ رونق محفل چل دیئے۔ اب محفل اداس تھی' مگر زندگی کے قافلے کو تو چلنا تھا' چلتا رہا' کچھ عرصہ آپ کی طرف سے خطوط کا سلسلہ جاری رہا پھر بند ہو گیا۔ چند خطوط لکھے' جواب نہ ملا تو میں نے بھی یہ سوچ کر خطوط لکھنے کا سلسلہ بند کر دیا کہ کہیں میرے خطوط ماضی کی یادوں کو تازہ کرنے اور حال کے سکون کو درہم برہم کرنے کا باعث نہ بن رہے ہوں' مجھے آپ کی خوشی مطلوب تھی' یہ دوسرا صدمہ بھی سہہ گیا ----- حالات نے مجھے سائنس کی جگہ آرٹس کی دہلیز پر

دھکیل دیا۔ پھر کچھ تعلیمی مصروفیات اور کچھ تنظیمی مصروفیات نے یوں گھیرا کہ ماضی کی باتیں میٹھی یاد ہی بن کر باقی رہ گئیں، کبھی کبھی ذہن کے کسی گوشہ سے آپ کا نام ابھرتا اور بس۔ کچھ دیر کے لئے ماضی میں کھو جاتا۔ مگر ماضی میں ڈوب کر پھر حال کی سطح پر ابھرنا ہی پڑتا------ آج جب آپ کا خط ملا تو تھوڑ دیر کے لئے میں حیرت و استعجاب کے سمندر میں ڈوب گیا، آپ کا نام پڑھنے کے باوجود ذہن یہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ یہ تحریر خالد ہی کی ہے۔ آخر ایک طویل مدت کے بعد انہیں تمہارا خیال کیسے آگیا، لیکن آپ کے نام کے ساتھ آپ کی تحریر بھی تو چغلی کھا رہی تھی کہ خط آپ ہی نے لکھا ہے۔ مانا کہ آپ کی تحریر چھ سال بعد ہی دیکھنے کا موقع ملا، لیکن آپ کی تحریریں تو میرے دل پر نقش رہی ہیں، اس لئے الفاظ کو پہچاننے میں کیسے غلطی ہو سکتی تھی۔ آپ نے خط میں ماضی کے واقعات دہرانے کے بعد حال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "چند دن قبل جب میں اپنے کالج کے ہاسٹل کی سیڑھیاں اتر رہا تھا تو نوٹس بورڈ پر آپ کا نام لکھا دیکھا کہ اسلامی جمعیت طلبہ کے زیر اہتمام ایک مذاکرے میں تقریر کریں گے، پہلے تو یقین نہ آیا، لیکن مزید تحقیق کی تو پتہ چلا کہ آپ ہی کا نام تھا، سوچا کہ چلو اسی بہانے ملاقات ہو جائے گی۔ لیکن تقریب سے ایک دن قبل ہی علم ہوا کہ حکمرانوں کو "مہمان" بنانے کی سوجھی ہے لہٰذا آپ مہمان بنا لئے گئے ہیں، آپ کے ساتھیوں سے ایڈریس معلوم کیا اور خط لکھ رہا ہوں۔ لیکن ------ ظفر----- یہ تو بتاؤ کہ مولوی کیسے بن گئے؟ ویسے اتنا بتا دوں کہ نہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی انتخابات میں اپنا ووٹ ہمیشہ آپ ہی کی تنظیم کے امیدواروں کے حق میں استعمال کیا ہے، شروع ہی سے اس تنظیم کے بارے میں اپنائیت کا جذبہ محسوس کرتا رہا ہوں، مگر آج اپنائیت کی اصل وجہ کا علم ہوا، آج کے بعد سے جی چاہتا ہے کہ اس تنظیم کی تفصیلات سے آگاہی حاصل کروں، معلومات یہاں سے بھی حاصل ہو سکتی ہیں لیکن اگر آپ مجھے بھول نہیں چکے تو کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ ہی تعارف کروائیں، ماضی کے ناطے سے میرا حق بھی تو بنتا ہے، اس طرح کچھ تذکرہ ماضی بھی چھڑے گا------"

والسلام

تمہارا خالد

بسم اللہ الرحمان الرحیم

میرے رفیق عزیز! یہ درست ہے کہ آج میں آزاد دنیا سے کٹ کر زنداں کی کوٹھڑی سے آپ سے مخاطب ہوں، مگر یقین جانیئے کہ میں اس وقت بھی آپ کو اپنے قریب پاتا ہوں، بہت ہی زیادہ قریب۔ اگر ذہنی فاصلے موجود نہ ہوں تو یہ ظاہری فاصلےاور زنداں کی اونچی سے اونچی فصلیں بھی رکاوٹ نہیں بن سکتیں، نظام کہنہ کی یہ بد کار دیواریں ہمارے درمیان زیادہ دیر تک حائل نہ ہو سکیں گی۔ اور وہ وقت جلد آئے گا، جب یہی دیواریں ریت کی دیواریں ثابت ہوں گی، اور یوں آزاد دنیا میں آپ سے ملنے اور باتیں کرنے کا موقع ملے گا، جب تک یہ صورت نہ ہو نصف ملاقات کا اہتمام تو ہو ہی سکتا ہے، کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان میں میری شمولیت حادثاتی اور اتفاقی عمل کا نتیجہ نہیں، بلکہ گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہے اور سچ پوچھیں تو آپ سے کیے گئے وعدہ کو عملی صورت دینے کا جذبہ تھا کہ ہمیں مل کر انسانوں کی فلاح کے لئے کام کرنا ہے اور ان کی بیماریوں کا علاج کرنا ہے۔ میں ڈاکٹر تو نہ بن سکا لیکن یہ کوشش ضروری ہے کہ انسانوں کی روحانی بیماریوں کا علاج ڈھونڈا جائے۔ اس تنظیم میں شمولیت کی صورت میں نہ صرف علاج کا علم ہوا ہے بلکہ معاشرے کی نبضوں پر ہاتھ رکھنے کا بھی موقع ملا ہے۔ انسان کی روح بیمار ہو تو جسم اضمحلال کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دنیا میں کوئی قوم بھی ہیضہ، تپ دق یا اس نوعیت کی دوسری مہلک بیماریوں کے نتیجہ میں صفحہ ہستی سے معدوم نہیں ہوئی بلکہ جب بھی معدوم ہوئی ہے روحانی بیماریوں کے نتیجہ میں ہوئی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قوم فرعون ہو یا قوم عاد و ثمود، قوم مدین ہو یا قوم یہود سب کی تباہی و بربادی کی بنیادی وجہ ان کا روحانی طور پر بیمار ہونا تھا۔ لہٰذا اصل بیماری روح کی بیماری ہے۔ اور اس علاج کئے بغیر معاشرے کو تباہی و بربادی سے نہیں بچایا جاسکتا۔ یہ درست ہے کہ صنعتی ترقی کا دور دورہ ہے، زمین سونا اگل رہی ہے، انسان ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے، لیکن ہائے اس انسان کی بد نصیبی کہ اس کے ضمیر کی کھیتی سوکھ چکی ہے، اس کے دل کی دنیا کے مقدر میں صرف اندھیرے ہیں! آج اس کے اندر کا انسان نزع کی کیفیت

سلا ہے۔ معاشرے میں پرانی قدروں کو متروک ٹھہرایا جاچکا ہے' قوم اپنی حرمتوں اور ذلتون کے داغ شراب کے چھینٹوں سے دھونا چاہتی ہے۔ مسجدیں نوحہ کناں ہیں' سینماؤں میں راتوں کو بھی دن کا گمان ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پوری قوم کو فحاشی کا مالیخولیا ہوگیا ہے' حوا کی بیٹی نے عین چوراہے میں شرم وحیا کی چادر اتار کر پھینک دی ہے' رہی سہی کسر اس سلسلہ میں آدم کے بیٹے پوری کر رہے ہیں' انسانیت ننگا ناچ ناچ رہی ہے۔ تہذیب و تمدن نے غاروں میں پناہ لے لی ہے۔ شرافت کی پگڑیوں کو اچھالا جارہا ہے۔ آپ پوچھتے ہیں کہ سقوط مشرقی پاکستان کا سانحہ کیوں رونما ہوا' میں کہتا ہوں کہ سقوط مشرقی پاکستان کا سانحہ بعد میں رونما ہوا ہے' اس ملک کے انسان کے روحانی وجود کے ٹوٹنے کا سانحہ پہلے رونما ہوچکا تھا۔

انہی حالات سے آج سے چودہ سو سال قبل کا عرب معاشرہ بھی دو چار تھا' بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا تھا' نفرت کی کھیتی سرسبز وشاداب تھی' اخوت کی کھیتی عرصہ ہوا کہ سوکھ گئی تھی ------- سچائی' شرافت' پاکیزگی' اصول نام کی چیزیں وہاں ڈھونڈے سے نہ ملتی تھیں' کہیں کہیں انفرادی سطح پر اگر سیرت وکردار کے چراغ روشن بھی تھے' تو ان کی روشنی اتنی مدھم تھی کہ اندھیروں کا سینہ چیرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی' ان حالات میں محسن انسانیت ﷺ نسخہ شفا لے کر آئے' قوم نے استعمال کرنے سے انکار کیا' آقائے دو جہاں مایوس ہونے کے بجائے مستقل مزاجی سے اس نسخہ کیمیا کی افادیت کو عام کرتے رہے' چراغ سے چراغ جلے' اور جب یہ چراغ ۳۱۳ کی تعداد میں وادی بدر میں جمع کئے گئے تو صرف مدینہ ہی نہیں جگمگا اٹھا تھا' بلکہ اس کی روشنی مکہ تک پہنچی۔ اور آخر کار عرب کے بوریہ نشینوں کو اس نسخہ کی افادیت کا قائل ہوتے ہوئے اسے استعمال کرنا پڑا۔ استعمال کرنے کی دیر تھی کہ معاشرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ معاشرہ جو نزع میں مبتلا تھا' اس کے چہرے پر جوانی کا نکھار آگیا' جہاں سے شرافت عرصہ ہوا کہ سرپیٹتے ہوئے نکل چکی تھی وہاں شرافت کی حکمرانی تھی' استحصال کا خاتمہ ہوچکا تھا' انسان دوبارہ درندگی سے انسانیت کی معراج اولی پر قدم رکھ چکا تھا۔ اور پھر اس نظام شوق کے اثرات کو پوری دنیا نے قبول کیا' بعد والے اپنے بزرگوں کی میراث کی قدر نہ کرسکے' نتیجتہ ان کے حصہ میں ذلت و رسوائی ہی آئی۔ ہم بھی اسی بدقسمت نسل سے تعلق رکھتے ہیں

جس نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے آباؤ اجداد کی کمائی کو لٹا دیا۔ ہمارا معاشرہ اگر تباہی سے بچ سکتا ہے تو صرف اسی نسخہ کیمیا پر عمل کرنے کے نتیجہ میں جس پر صحرا نشینان عرب نے عمل کیا تھا۔

اسلامی جمعیت طلبہ اسی نسخہ کیمیا کو پانے کی جہد مسلسل کا نام ہے۔ اس تنظیم نے چودہ سو سال قبل کے ماضی سے تعلق جوڑ رکھا ہے۔ اکتساب نور وہیں سے ہو رہا ہے' یہ تنظیم ماضی کے چراغ کی حیات آفریں روشنی سے حال و مستقبل کی گزر گاہوں کو روشن کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ یہاں آپ کو جذبات کا سیل رواں بھی ملے گا' تدبر بھی' فہم و فراست بھی' خلوص وجذبہ صدق بھی' پاکیزگی بھی اور شرافت و جرات بھی ----
میرے نزدیک اسلامی جمعیت طلبہ وہ گھنا درخت ہے' جس کی چھاؤں میں ہم لادینیت' فحاشی' بے حیائی اور ظلم و تشدد کی تیز دھوپ سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں۔ آپ کو اس کی دعوت کے اثرات اب صرف تعلیمی اداروں کے اندر ہی محسوس نہیں ہوں گے' بلکہ عملاً معاشرہ میں بھی اس کے اثرات کی پرچھائیں محسوس کئے بغیر آپ نہ رہ سکیں گے۔
اس قافلہ شوق کا آغاز ۲۳ دسمبر ۱۹۴۷ء کو ۲۰'۲۵ افراد کے رخت سفر باندھنے سے ہوا تھا' چونکہ اس کی پشت پر اخلاص کی دعوت تھی' نیک نیتی و نیک نفسی کی دولت تھی' اور اس کا تعلق اس چشمہ صافی سے تھا جس کا پانی کبھی گدلا نہیں ہو سکتا' یہی وجہ ہے کہ آج اس قافلہ کے ڈیڑھ لاکھ سے زائد نوجوان اپنی پر عزم جوانیوں کے ساتھ موجود ہیں۔
۲۶ سال کے عرصہ میں ہر طرح کی آزمائشوں کے تیروں کی اس پر بارش کی گئی' کبھی جیلوں کے دروازے کھولے گئے تو کبھی تعلیمی اداروں کے دروازے بند کیے گئے۔ کبھی تشدد کی سولی پر لٹکایا گیا تو کبھی کیریر کے عدم تحفظ کی نزاکتوں سے آگاہ کیا گیا' والدین کو دھمکیوں سے مرعوب کرنے کی چالیں چلی گئیں' ہمارے ساتھیوں کے چہرے زخمی ہوئے' ان کے سینوں پر زخموں کے پھول سجے' لیکن راستہ طے ہوتا رہا۔ اور آج یہ قافلہ اس مقام پر پہنچ چکا ہے جہاں اس کو مٹانے والے انشاء اللہ مٹ جائیں گے لیکن اس کاروان شوق کی راہ کو کھوٹا نہ کر سکیں گے۔ اس تنظیم کی دعوت کو اگر پذیرائی حاصل ہوئی ہے اور آج اگر اس تنظیم کے کارکنوں میں صبر و عزیمت کی قوتیں پیدا ہوئی ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس تنظیم سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے پیش نظر پاکیزہ مقصد

رکھتے ہیں‘ کرسیوں کے لئے جوڑ توڑ‘ عہدوں کی طلب و خواہش‘ نام کی تشہیر کا شوق‘ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی آپ یہاں نہ پائیں گے‘ یہاں آپ کو دھڑے بندیاں نظر نہ آئیں گی‘ کوئی ذہنی انتشار نظر نہ آئے گا۔ کیونکہ اس تنظیم کا ہر کارکن اپنا مقصد تخلیق یہی سمجھتا ہے کہ اسے دنیا میں ”اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق انسانی زندگی کی تعمیر کے ذریعے رضائے الٰہی کے حصول کی فکر کرنی ہے۔“ اور اسی بناء پر اسلامی جمعیت طلبہ نے اس بات کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔ منزل کا تعین ہو جائے‘ طلب صادق ہو تو کبھی نہ کبھی راہی منزل مقصود پر پہنچ ہی جاتا ہے‘ ہمارا سفر بھی جاری ہے‘ اور یہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ منزل مراد پر پہنچ نہیں جاتے‘ یا زندگی کی باگیں کھینچ نہیں لی جاتیں۔

میرے رفیق عزیز! خط طویل ہو گیا‘ لیکن کیا کروں کہ آپ نے ذکر ہی اس پری وش کا چھیڑا کہ جس کے متعلق باتوں کو دو چار فقروں میں سمویا ہی نہیں جاسکتا۔ زندگی رہی تو آئندہ میں آپ کو اس تنظیم کی دعوت سے تفصیلی انداز میں آگاہ کرنے کی کوشش کروں گا‘ اس خط کو محض تجدید تعلق ہی کا نام دے دیں تو بہتر رہے گا۔ جہاں تک جیل کا تعلق ہے دن خوب کٹ رہے ہیں۔----- اطمینان قلب ہو تو کٹھن منزلیں خود ہی طے ہو جاتی ہیں ------ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

والسلام

ظفر جمال بلوچ

بسم اللہ الرحمان الرحیم

برادر عزیز!

محبتیں اور سلام۔ آپ کا خط گزشتہ دنوں موصول ہوگیا تھا' یہ اطلاع تو آپ کو مل ہی چکی ہوگی کہ نظربندی کی میعاد مکمل ہونے پر کل دو نئے مقدمات کے تحت مجھے دوبارہ پابند سلاسل کر دیا۔ یوں آپ سے ملنے کی خواہش کو کچھ دن اور سینے میں دبا کر رکھنا ہوگا۔ حکمران چاہتے ہیں کہ ہم مصائب و آلام سے ڈر کر ان کے سامنے جھکنے والے بن جائیں اور راہ نوردی شوق کو ترک کر دیں۔ انہیں کون یہ بتائے کہ در حبیب پہ جھکنے والی گردنوں کو کسی اور کے در پر جھکنے پر مجبور اور آمادہ نہیں کیا جاسکتا۔ انہیں آزمانے کا شوق ہے تو آزمائیں' ہمیں توقع ہے کہ انشاء اللہ ماضی کی طرح انہیں رسوائیاں سمیٹنا ہوں گی اور ہم سرخرو ہوں گے۔ یہ کام اسی کے دین کا ہے' اس لئے اس کام کے شایان شان صبر و استقامت اور مصائب جھیلنے کی جرات بھی اسی کی طرف سے عطا کی جائے گی' نہ ہمیں پہلے کبھی اپنی قوت پر ناز تھا' نہ اب ہے' پہلے بھی اسی کی قوت کے سہارے منزل شوق کی جانب قدم بڑھائے ہیں' اور اب بھی اسی کی مدد اور قوت کے سہارے اس وادی پر خار کو طے کریں گے۔

ان حکمرانوں کو ملک و ملت سے کچھ بھی محبت ہوتی تو ان کی طرف سے اگر تعاون کا ہاتھ نہ بڑھایا جاتا تو کم از کم ہمارے راستے کا روڑا بھی ثابت نہ ہوتے' کیونکہ اسلامی جمعیت طلبہ جس پاکیزگی فکر کو پیدا کرنا چاہتی ہے اس کا اہتمام کئے بغیر غلامی کے مہیب اور ڈراؤنے دیو سے اس قوم کو نہیں بچایا جاسکتا۔ گزشتہ پچیس سالوں میں اسلام سے غداری کی گئی اس کے نظریہ کو پس پشت ڈال دیا گیا' اس کے اثرات کو سیاست کی وادی سے لے کر تعلیمی اداروں کی چار دیواریوں تک سے نکال باہر کرنے کی کوششیں کی گئیں' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قوم جو کبھی ایک تھی' جس کے ہاں محبت و اخوت کے زمزمے بہتے تھے ٹکڑیوں میں بٹ گئی۔ آج ہم سندھی' پنجابی' بلوچ' پٹھان اور بنگالی پہلے ہیں مسلمان اور پاکستانی بعد میں۔ اس بنا پر ذہنی فاصلوں میں کمی آنے کے بجائے روز بروز اضافہ ہورہا ہے' نفرت کی دیواریں زیادہ تیزی سے کھڑی کی جارہی ہیں' تشدد اور نفرت کے

بارود کو ہوا دی جا رہی ہے۔ مشرقی پاکستان اس کے ہاتھوں جل گیا' آج مشرقی پاکستان کی فضائیں لہو رو رہی ہیں۔ میری بہنوں کے سروں سے آنچل اتار دیئے گئے ہیں' میرے بھائیوں کے خون سے دریاؤں کے پانی کو سرخ کر دیا گیا ہے' میری ماؤں کی عزت و عفت اور بزرگی کے لباس کو تار تار کر دیا گیا ہے' اب یہ نفرت کی آگ مغرب کی طرف بڑھ رہی ہے' ہم اس آگ کو بجھانا چاہتے ہیں تو قابل گردن زدن ہیں' اور جو اس آگ کو بھڑکانے کی فکر میں ہیں ان کے لئے اقتدار کا دست شفقت ہے۔ میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ مجھے پس دیوار زنداں کیوں دھکیلا گیا' یا وقتاً فوقتاً میرے دیگر ساتھیوں کو کیوں گرفتار کیا جاتا ہے' کیا ہم چور' ڈاکو' قاتل یا لٹیرے ہیں؟ کیا ہم نسلی لسانی اور علاقائی فتنوں کو ہوا دے رہے ہیں؟ ہمارا جرم صرف اور صرف یہ ہے کہ ہم اسلام کی بالادستی چاہتے ہیں ----- ہم منافقت کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ آج ان کو تحفظ پاکستان کے نام پر گرفتار کیا جا رہا ہے' جن کے ساتھیوں نے مشرقی پاکستان میں اپنے دس ہزار ساتھیوں کے سروں کی فصل کٹوائی' جنہوں نے اس وقت پاکستان کے پرچم کی حفاظت کی' جب حفاظت کرنے کا صاف مطلب اپنی موت کے سرٹیفکیٹ پر دستخط کرنا تھے۔ جن کے ساتھی آج بھی ڈھاکہ' راجشاہی' پبنہ' جیسور اور نواکھلی وغیرہ کی جیلوں میں پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے سے باز نہیں آتے وہ جنہوں نے تزئین گلستان کے لئے خون پیش کیا' انہی کو گلستان کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق نہیں؟ اور یہ ناروا پابندیاں ان کی طرف سے عائد کی جا رہی ہیں جن کا اس ملک کی تعمیر اور بناؤ کے سلسلہ میں پسینہ کا ایک قطرہ بھی نہیں بہا۔ اس موقع پر میں اس کے علاوہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ

نیرنگی سیاست دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

میں دور چلا گیا' کہہ تو یہ رہا تھا کہ اسلامی جمعیت طلبہ سالمیت پاکستان کا مظہر بن چکی ہے' آج اس کے پلیٹ فارم پر سندھی' پنجابی' بلوچ' پٹھان حتیٰ کے بنگالی تک موجود ہیں اور یہ سب افراد ایک دوسرے کے دست و بازو بنتے ہوئے اس ملک میں اقامت دین کے لئے کوشاں ہیں' انہیں یہ جذبہ' یہ جنون اور عشق ایمانی کی دولت لازوال کہاں سے

میسر آئی؟ صرف اور صرف اسلامی جمعیت طلبہ ہی کی بدولت' جس نے اس ملک کے نوجوانوں کو اسلام کی انقلابیت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی' جس نے ان کے ذہنوں میں موجود شکوک و شبہات کے کانٹوں کو صاف کیا' انہیں تشکیک اور تذبذب کی وادی سے نکال کر ایمان کی شاہراہ مستقیم پر لا کھڑا کیا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ طلبہ تک اسلام کی دعوت کو پہنچانا یہ کون سا اہم کام ہے؟ یہ طلبہ مسلمان گروہ سے تعلق رکھتے ہیں' شروع ہی سے مسلمان ہیں' ان تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے کیا معنی ----؟ لیکن رفیق عزیز! اگر موجودہ معاشرے کی اصل تصویر آپ کے سامنے ہو تو شاید آپ کو اس قسم کا سوال کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی یہاں انگریزوں نے برصغیر پاک و ہند میں ملازمتوں اور ترقی کے سلسلہ میں مغربی تعلیم کو لازمی قرار دے دیا۔ نتیجتہ شروع ہی سے یہاں دو مکاتب فکر نے جنم لیا' ایک مغربی نظام تعلیم سے تعلق رکھنے والا گروہ اور دوسرا دینی نظام تعلیم سے تعلق رکھنے والا گروہ۔ مغربی فکر کا پلہ ابتدا ہی سے بھاری ہوگیا' کیونکہ کھاتے پیتے گھرانوں کے ذہین بچوں نے مغربی نظام تعلیم کو اپنایا' یہی لوگ میدان سیاست میں آگے بڑھے' یہی لوگ سرکاری محکموں میں بھرتی ہوئے' اور یہی لوگ انتظامی مشنری کے کل پرزے بنے' چونکہ یہ عملاً مقتدر گروہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کے افکار' ان کی عادات ان کی روایات اور ان کے نظریات کو پورے معاشرے میں شرف قبولیت حاصل ہوا۔ پھر ذرائع ابلاغ کے تمام تر ذرائع پر قابض ہونے کی وجہ سے لوگوں کے اذہان کو پروپیگنڈہ کے زور سے بھی بری طرح متاثر کیا' جب کہ اس کے مقابل میں جس گروہ نے دینی تعلیم کی طرف توجہ دی' معاشرہ کا مسترد شدہ عنصر تھا' جو ذہنی جسمانی وسائل کے لحاظ سے پسماندہ گروہ تھا' اس گروہ میں بلا شبہ بعض بہت باصلاحیت اور خاندانی شرف رکھنے والے لوگ بھی شامل تھے لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی' اس لئے یہ گروہ دینی تعلیم کے حصول کے بعد ذہناً اس پوزیشن میں نہ تھا کہ مغربی فکر سے متاثر افراد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے اور ان سے اپنا وزن منوا سکے' ذہناً اس گروہ نے پہلے ہی دن ہتھیار پھینک دیئے اور احساس کمتری میں مبتلا ہوگیا۔ اس احساس کمتری کی بیماری میں انہوں نے مغربی فکر کے حاملین سے نفرت کا اظہار کرنا شروع کر دیا' اس

طرح سابق کی روایات کی وجہ سے دونوں گروہوں میں جو تھوڑا بہت ربط ضبط تھا بھی سہی وہ بھی ٹوٹ گیا اور ذہنی فاصلے بڑھ گئے۔ ایک گروہ کے نزدیک کالجوں اور یونیورسٹیوں سے پڑھ کر نکلنے والی نسل کافر تھی' جب کہ دوسرے گروہ کے نزدیک دینی تعلیم پانے والے ازکار رفتہ لوگ تھے۔ یوں اس گروہ کی طرف سے نوجوان نسل کو دین کی طرف راغب کرنے کے سلسلہ میں کوئی قابل قدر کام نہ ہوسکا۔ دوسری طرف مغربی افکار اور تہذیب کی یلغار سے گھروں کی چاردیواریاں بھی محفوظ نہ رہ سکیں' لہٰذا گھروں کے ماحول سے بھی نوجوانوں کو بہت حد تک وہ تقدس اور پاکیزگی میسر نہ آئی جو ان کی نگاہ کو مسلمان میں کوئی مفید کردار ادا کر سکتی' تیسری طرف نظام تعلیم میں بھی دینی اور نئی نظریات و احساسات کو سمونے کی کوشش نہ کی گئی' اور بد قسمتی سے اساتذہ بھی اس نسل کو وہ میسر آئے جو خود اخلاق باختگی کا شکار تھے۔ الا ماشاءاللہ۔ اس لئے یہ ماحول بھی انہیں اپنے دین کے معاملہ میں عصبیت پیدا کرنے میں مدد فراہم نہ کر سکا۔
ایک طرف یہ صورت تھی تو دوسری طرف باطل نظریات کے اسلام اور اسلامی تہذیب پر تابڑتوڑ حملوں نے نوجوانوں کو بری طرح متاثر کیا۔ خاندانی روایات کی بناء پر اگر دین کے بارے میں کچھ احساسات اس نسل میں باقی تھے تو اس حد تک تو باقی رہے کہ اس نسل کو علانیہ دین کا انکار کرنے کی جرات نہ ہوئی' لیکن دوسری طرف مخالفانہ پروپیگنڈہ اور غلط تعلیم کی وجہ سے دین کی کاملیت کا اعلان کرنے کو بھی یہ نسل تیار نہ ہو سکی۔ اس میں قصور نوجوان نسل کا قطعاً نہیں تھا' قصور تھا تو بزرگوں کا تھا' حکمرانوں کا تھا' اساتذہ کا تھا' معاشرے اور ماحول کا تھا کہ جن کی طرف سے دینی ورثہ کو اس نسل کی طرف منتقل کرنے کی کوئی شعوری کوشش نہ کی گئی۔ انسان آئیڈیل کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا' اسے خدا کی ذات کا عرفان حاصل نہ ہوا تو اس نے پتھروں' درختوں اور چاند ستاروں کو اپنا مشکل کشا ٹھہرایا۔ کوئی خواہش نفس کے سامنے جھک گیا' پیشانی جھکنے کے لئے بنائی گئی ہے خدا کے در پر ----- جھکنے کے سلسلہ میں اس کی راہنمائی نہ کی گئی تو یہ ہر در کو در حبیب سمجھ کر جھکے گی' نوجوان نسل کو جب اسلام کے کسی آئیڈیل سے متعارف نہ کروایا گیا تو اپنے فطری جذبہ کے ہاتھوں مجبور ہوکر اس نے مغرب کو اپنا روحانی قبلہ قرار دے دیا' کارل مارکس اور ماؤزے تنگ کے اتباع کو باعث سعادت جانا' اپنے سینے

پر ماؤزے تنگ اور کارل مارکس کے بیجز لگائے اور یہ بھول گئی کہ جب چاروں طرف درندگی کا راج تھا تو حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت سعد بن وقاص، خالد بن ولید رضوان اللہ علیہم اجمعین اور یوسف بن تاشفین، صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم، عمر بن عبدالعزیز رحمہم اللہ جیسے اکابرین اسلام نے انسانیت کی زلفوں کو سنوارا تھا۔ اور ان کو بدر کامل کی حیثیت دینے والی وہ عظیم شخصیت تھی جسے کمال انسانیت اور معراج انسانیت کا مقام حاصل ہے۔ جو حاصل کائنات ہیں، اور جن کی زندگی کا ہر گوشہ قابل تقلید ہے۔

ان حالات میں اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ اس نوجوان نسل کو اسلام کی دعوت سے روشناس کراتے ہوئے اس کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے پر آمادہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ اسلام صرف مسجد کے اندر کی دنیا ہی کے بارے میں ایک ضابطہ نہیں رکھتا، بلکہ مسجد سے باہر کی وسیع و عریض دنیا کے لئے بھی ایک تفصیلی ہدایت نامہ رکھتا ہے، وہ صرف انسان کی روح کے لئے ہی تقویٰ و پرہیز گاری کی صورت میں غذا مہیا نہیں کرتا بلکہ اس کے جسم کے تقاضوں اور مطالبات کو بھی مد نظر رکھتا ہے۔ اس کا ایک نظام معیشت ہے، اور دنیا کا بہترین نظام ہے، اس کا ایک نظام تہذیب و تمدن ہے، ایک نظام سیاست ہے، ایک نظام اخلاق و معاشرت ہے۔ اور ایک مربوط موثر نظام عبادت و تربیت ہے۔ دنیا کا کوئی نظام بھی مکمل اور اکمل صورت میں بشمول کیمونزم اور سرمایہ داری کے کبھی بھی رائج نہیں رہا سوائے اسلام کے۔ کہ جس کا نظام حکومت تو خلافت راشدہ کے بعد ملوکیت کی نذر ہو گیا، لیکن اس کا نظام قانون اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک کسی نہ کسی صورت میں موجود اور برقرار رہا۔ اور جب مغرب ننگا تھا اسلام نے انسانیت کو تقویٰ و پرہیز گاری کا لباس دیا۔ دنیا تمام تر نظاموں اور ازموں کو اپنا کر دیکھ چکی ہے، لیکن اسے سوائے بے چینی، پریشانی اور اضطراب کے کچھ نہ مل سکا۔ آج یہی نظام انسانیت کے دکھوں کا مداوا بن سکتا ہے، ان کے زخموں پر مرہم لگا سکتا ہے، اگر فی الواقع مغرب کے نظام میں کشش ہوتی تو وہاں کی نوجوان نسل کو ہپیوں کا روپ دھار کر جنگلوں اور غاروں کا رخ نہ کرنا پڑتا۔

آج اسلامی جمعیت طلبہ کی طرف سے مہیا وہ وسیع لٹریچر ان تمام تر امور کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس لٹریچر میں مولویانہ تاویلات سے کام لینے کے بجائے دلائل سے کام لیتے ہوئے نوجوان نسل کی عقل سلیم اور قلب مومنانہ کو متاثر کرنے کی کوشش کی گئی ہے' اس لٹریچر کا یہ اعجاز ہے کہ وہ نسل جو کبھی ماؤ' لکمن اور کارل مارکس پر فخر کرتی تھی آج محسن انسانیت ﷺ کی قیادت وراہنمائی پر فخر کرتی اور انہی کے نظام کے غلبہ کے لئے اپنی شہ رگ کا خون بہانا بھی باعث سعادت سمجھتی ہے۔ آج ایک ایک یونیورسٹی' ایک ایک تعلیمی ادارے سے انقلاب انقلاب ------ اسلامی انقلاب کی صدائیں گونج رہی ہیں۔ اس لٹریچر نے نوجوانوں کے ذہنوں کو بدلا ہے' ان کے قلب کی دنیا کو منور کیا ہے' ان کے اعمال کی دنیا میں ہلچل پیدا کی ہے۔ اس لٹریچر نے' نہیں دلائل کی وہ قوت عطا کی ہے جس کے نتیجہ میں جہاں ایک طرف اسلام کے بارے میں ان کے اندر اعتماد کی کیفیت پیدا ہوئی ہے وہیں باطل نظریات کا پوسٹ مارٹم کرنے کی بھی انہیں جرات ہوئی ہے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کا یہ لٹریچر اس لئے بھی نوجوانوں کو اپیل کرتا ہے کہ اس میں دیوبندگی' بریلوی' شیعہ یا اہل حدیث کی دعوت نہیں پیش کی گئی بلکہ محسن انسانیت ﷺ کے اسلام کی دعوت کو پیش کیا گیا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا نعوذ باللہ آنحضرت ﷺ دیوبندی تھے' بریلوی تھے' اہل حدیث تھے' شیعہ تھے؟ نہیں ہمارے آقا صرف اور صرف مسلم تھے اور حنیف مسلم تھے۔ یہ گروہ بندیاں' یہ تفرقے بازیاں اسلام کی قوت کو کمزور کرنے کا باعث تو ہو سکتی ہیں' مضبوط کرنے کا باعث ہرگز نہیں ہوسکتیں' لوگوں نے فروعی اختلافات کو دین وایمان کا مسئلہ بنا کر پوری امت کو ٹکڑوں میں بانٹ کر ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی علیحدہ مساجد کھڑی کر دیں۔ اور ہر مسجد پر "داخلہ کے حقوق محفوظ ہیں" کا بورڈ لگا دیا۔

اس موقع پر مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے کہ ایک مشہور عالم دین مولانا عنایت اللہ گجراتی نے ایک نوجوان کو نصیحت کی کہ "بیٹا جب تمہیں اللہ نے صحت دی ہے' جوانی دی ہے' سوچنے کو ذہن' بولنے کو زبان' چلنے کو ٹانگیں اور کام کرنے کو ہاتھ دیئے ہیں۔ تو پھر تم اس کا شکریہ کیوں ادا نہیں کرتے؟ کیونکہ جہاں خدا یہ چیزیں دینے کی قدرت رکھتا ہے' وہیں لینے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔" نوجوان کی سمجھ میں بات آگئی اور اس نے نماز

پڑھنی شروع کردی۔ کچھ عرصہ کے لئے مولانا باہر مختلف پروگراموں میں شرکت کرنے کے لئے چلے گئے' واپس آئے تو دیکھا کہ نوجوان دوبارہ فلموں کا رسیا بن چکا ہے' بلایا اور کہا کہ میں نے تو تمہیں مسجد کا راستہ دکھایا تھا' سینما کا راستہ کس نے دکھادیا؟ تو اس نوجوان نے کہا کہ "مولانا صاحب جو سکون مجھے سینما میں محسوس ہوتا ہے' مسجد میں محسوس نہ ہوا' آپ کے کہنے پر مسجد کا رخ کیا' نماز پڑھ کر باہر نکلا تو کچھ لوگوں نے کہا کن بدعتیوں کی مسجد میں نماز پڑھ لی ہے' دوسری مسجد میں جاؤ' وہاں سے نماز پڑھ کر نکلا تو تبصرہ ہوا کہ ان لوگوں کا تو عقیدہ ہی درست نہیں' یہاں نماز پڑھوگے تو سابقہ ادا کی جانے والی نمازیں بھی فاسد ہوجائیں گی' تیسری مسجد میں گیا تو تبصروں نے پھر بھی جان نہ چھوڑی' پریشانی کی حالت میں نماز ترک کردی اور ایک دن سینما کا رخ کیا' ٹکٹ لے کر اندر پہنچا تو سکون محسوس ہوا کہ ایک ہی قطار میں دیوبندی' بریلوی' اہلحدیث اور شیعہ بیٹھے ہیں' لیکن کیا مجال جو کسی کو کسی پر اعتراض ہو۔"

میرے دوست اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہوسکتی ہے کہ ہم سینما جیسے برائی کے اڈے میں تو مل کر بیٹھ سکتے ہیں' لیکن ایک مسجد میں مل کر نہیں بیٹھ سکتے۔ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ جمعیت کی انقلابی دعوت کے نتیجہ میں تعلیمی اداروں میں تفرقہ بازی کی وبا نہ پھیل سکی' اور آج اسلام کی دعوت کو سمجھنے اور اس کے عملی تقاضوں کو ادا کرنے کی مخلصانہ خواہش ہی کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ جمعیت کے پلیٹ فارم پر آپ کو دیوبندی' بریلوی' اہلحدیث' شیعہ غرض ہر اس مکتب فکر کے افراد ملیں گے جو کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرنے والے اور حضور کے خاتم النبیین ہونے کو ماننے اور ان کے نظام کے لئے کام کرنے کو تیار ہیں۔

خط کی طوالت مجھے قلم رکھنے پر مجبور کر رہی ہے' زندگی رہی تو بقیہ باتیں آپ کو اگلے خط میں لکھوں گا۔ انشاء اللہ

میری نیک دعائیں و تمنائیں آپ کے لئے ہیں۔

والسلام

ظفر جمال بلوچ

بسم اللہ الرحمان الرحیم

برادر عزیز!

السلام علیکم۔ مجھے یہی توقع تھی کہ خط پڑھنے کے بعد پہلا سوال آپ کے ذہن میں یہ جنم لے گا کہ اسلام کا علم حاصل کرنا درست' اپنی زندگی کے تمام تر معاملات کو اس حاصل کردہ علم کے تابع کرنا بھی درست' لیکن نیکی کے جھنڈے کو لے کر اٹھنا اور ایک جماعت کی حیثیت اختیار کر کے رہنا' آخر اس کی کیا ضرورت ہے؟ بالخصوص ان حالات میں جب کہ نیکی اور بدی' جھوٹ اور سچ' عزت اور بے عزتی کو جانچنے اور پرکھنے کے پیمانے تبدیل ہو چکے ہیں' لوگوں نے مادیت کی عینکیں چڑھا رکھی ہیں اور مادیت ہی کے پیمانوں سے افراد انسانی کی شرافت اور بزرگی کو ناپنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر اس قوم نے خود ہی تباہ ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے تو ہم چاہنے کے باوجود بھی اس قوم کو تباہی و بربادی کے غار میں گرنے سے نہیں بچا سکتے۔ جو قوم خود ہی بھلے اور برے کی تمیز کو کھو بیٹھے' اسے کوئی معجزہ ہی راہ راست پر رکھ سکتا ہے۔ لیکن معجزوں کا دور گزر چکا۔ اب معجزات بار بار ظاہر نہ ہوں گے' اور بالخصوص کسی بے عمل قوم کے حق میں معجزات ظاہر نہیں ہوا کرتے۔ وہ قوم جو مولانا محمد علی جوہر جیسے شریف النفس قائد کو بھی "چندہ باز" کا خطاب دے سکتی ہے' اس قوم سے خیر کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس قوم کو سید احمد شہید سے لے کر جمال الدین افغانی تک نے جاگنے اور بیدار ہونے کی دعوت دی' لیکن یہ قوم ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس نے اپنے ہی محسنوں کے گلے کاٹے' اپنے ہی محسنوں کو مسترد کیا' یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ قوم پتھر کے بتوں میں تبدیل ہو چکی ہے' جس کے اندر حرکت' حرارت اور زندگی کے آثار نہ پائے جاتے ہیں' نہ پیدا ہو سکیں گے۔ جو قوم آج تک سچ اور جھوٹ میں تمیز نہ کر سکی' جس نے داعی اسلام کو نظر انداز کیا اور "ہے جمالو" کے نعرے لگانے والوں اور ناچنے و تھرکنے والے لوگوں کو قائدین کی صف میں جگہ دی' اور انہیں اقتدار کی کرسی تک پہنچایا' جو قوم سقوط مشرقی پاکستان کے سانحہ کو خاموشی سے برداشت کر گئی۔ ان کی بستی میں نیکی کی دعوت پھیلانا ایسا ہی ہے جیسے جنگلوں میں اذانیں دی جائیں۔ لہذا کب تک جنگلوں میں اذانیں دو گے' بہتر ہے کہ

اس بستی کے رہنے والوں کو اپنے حال پر چھوڑتے ہوئے خود اپنے من کی دنیا میں ڈوب جایا جائے' شاید اس طرح زندگی کا سراغ مل سکے۔

میرے رفیق عزیز! آپ کی باتیں درست' حقائق کی جدت نے آپ کی باتوں میں گرمی اور تلخی کا اضافہ کر دیا ہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ کیا مشرقی پاکستان میں البدر کی صورت میں مکتی باہنی اور ہندوستان کی فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے خون کا نذرانہ پیش کرنے والے دس ہزار نوجوان اسی قوم سے تعلق نہ رکھتے تھے' بنگلہ دیش نامنظور تحریک میں پنجاب کی جیلوں میں محبوس ہونے والے ساڑھے تین ہزار نوجوان کیا اسی قوم سے تعلق نہ رکھتے تھے؟ اور آج ختم نبوت کی تحریک میں جو نوجوان ہراول دستہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں' جنھوں نے ایک ایک بستی اور گاؤں میں ایمانی غیرت وحمیت کی جوت جگائی ہے' اور جنوں کی داستان میں نیا رنگ بھر رہے ہیں کیا یہ اسی قوم سے تعلق نہیں رکھتے؟ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ خود اسلامی جمعیت طلبہ جس کے سابقہ کر . . سے آپ بھی مطمئن ہیں' اس سے تعاون کرنے والے ڈیڑھ لاکھ سے زائد طلبہ کیا اسی قوم سے تعلق نہیں رکھتے جسے ابھی آپ پتھروں کی مورتیوں کا خطاب دے چکے ہیں؟ اس سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ ابھی یہ قوم مکمل طور پر پتھروں کی مورتیوں میں تبدیل نہیں ہوئی' بلکہ اس میں زندگی کے کچھ آثار موجود ہیں' اور ہمارا کام زندگی کے آثار رکھنے والے افراد کو ڈھونڈ کر ایک جگہ جمع کرنا ہے کہ جہاں ایک طرف یہ بے حسی اور بے عملی کے حملوں سے بچ سکیں' وہیں اس بستی کے بقیہ افراد کو بھی عمل کے انجکشن لگاتے ہوئے حرکت اور عمل پر مجبور کر سکیں' اسلامی نظام زندگی کے لئے کام کرنے والے طلبہ کا ایک تنظیم کی صورت میں منظم ہونا' جہاں اس لئے مفید اور ضروری ہے کہ اس کے نتیجہ میں بگاڑ کے راستے میں بند باندھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے' شریعت کی ایک ضرورت کو پورا کیا جا سکتا ہے وہیں اس نظم وتنظیم کی ضرورت اپنی ایمانی زندگی کے تحفظ وبقا کے لئے بھی ہے۔ تنظیم کی کشتی میں سفر کرنے کے بجائے انفرادی طور پر اس معاشرے میں نیک بن کر رہنا اور برائیوں سے بچنا ایسے ہی ہے کہ جیسے اس شعر پر عمل کرنا ہے کہ

درمیاں قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
بازی گوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش

کسی تعلیمی ادارے میں گھوم پھر کر دیکھ لیں۔ کسی بستی کا جائزہ لے لیں' آپ کو کوئی غنڈہ اکیلا نظر نہیں آئے گا' ان کی ایک ٹولی ہوگی' ایک جتھا ہوگا' سوال یہ ہے کہ جب کچھ لوگ بگاڑ اور تخریب کے لئے جمع ہوسکتے ہیں تو نیکی اور بناؤ کے لئے کیوں مجتمع نہیں ہوسکتے۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ منظم بدی کا مقابلہ منظم نیکی سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ آپ معاشرے کی موجودہ بے حسی سے بددل ہوچکے ہیں' لیکن یہ کیوں بھولتے ہیں کہ جمعیت ہی کے پروگرام پر عمل کرنے کے نتیجہ میں چراغ سے چراغ جل سکتا ہے' شمع سے شمع روشن ہوسکتی ہے' اور اگر دلجمعی کے ساتھ چراغ جلانے کا کام کیا جاتا رہے تو ایک وقت آئے گا جب معاشرے کا مقدر اندھیرا نہیں اجالا ہوگا۔ اور ظلم' زیادتی اور فحاشی کے لشکر کو کہیں پناہ نہ مل سکے گی۔ امت مسلمہ میں شامل ہونے کی وجہ سے انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی ہماری ذمہ داری نیکیوں کو پھیلانا اور برائیوں کو روکنے کی کوشش کرنا ہے' کیونکہ قرآن میں پوری امت مسلمہ کے بارے میں یہ آیا ہے کہ

کنتم خیر امتہ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔

جب تک امت مسلمہ کا کوئی ایک فرد بھی روئے زمین پر باقی رہے اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنے فرض کو انجام دیتا رہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بحیثیت جماعت بھی یہ ذمہ داری ہمیں سونپی ہے اور بحیثیت فرد بھی ------ مسلمانوں کے لئے **خیر امتہ** ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف اپنی ذات کی خدمت کے لئے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ تمام انسانیت کی خدمت ان کا مقصد وجود ہے۔ ان کے شرف کا راز "**اخرجت للناس**" میں پوشیدہ ہے۔ وہ قوم پرستی یا وطن پرستی کے لئے نہیں اٹھائے گئے۔ بلکہ یہ عین فطرت اسلام کا تقاضا ہے کہ وہ خادم انسانیت بن کر رہیں' یعنی ان کا کام صرف خود نیکی کو قبول کرنا یا محض اپنی قوم ہی کو نیکی کی دعوت دینا نہیں بلکہ پوری انسانیت کو فلاح و راستی کی طرف بلانا ان کی ذمہ داری ہے۔ اس لحاظ سے تو ہماری ذمہ داریوں میں بے پناہ اضافہ ہوجاتا ہے کجا یہ کہ ہم اپنی قوم کے اندر بھی اپنی ذمہ داری کو پورا

کرنے کی کوشش نہ کریں، قرآن وحدیث کے مطالعہ سے یہ بات واضح انداز میں ہمارے سامنے آتی ہے کہ "خود نیک بننا اور بدی سے پرہیز کرنا مقدم رکھا گیا اور نیک بنانا اور بدی سے روکنا موخر" اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نیک بنانے سے پہلے نیک بننا ضروری ہے، لیکن جس طرح اپنا پیٹ بھرنے سے دوسرے کا پیٹ بھرنا زیادہ افضل ہے، اسی طرح فضیلت کے اعتبار سے نیکی کو پھیلانا اور بدی کو روکنے کا درجہ بھی نیک بننے اور بدی کو ترک کرنے سے زیادہ ہے۔ کیونکہ ایک اپنی خدمت ہے اور دوسری اپنے ابنائے نوع کی خدمت۔ ایک محض انسانیت کے درجہ میں ہے اور دوسری انسانیت کاملہ کے درجہ میں ہے۔ نیکی پر خود عمل کرنا اور بدی سے خود پرہیز کرنا یقیناً ایک اچھی صفت ہے اور ایک شریف آدمی کا شیوہ بھی۔ مگر شرافت کا کمال اور بزرگی کا اعلیٰ درجہ اس وقت تک کسی انسان کو نصیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ دوسرے لوگوں کو بھی نیکو کار بنانے اور برائی سے روکنے کی کوشش نہ کرے۔ انسان کی فطرت ہے کہ اگر اسے کوئی چیز ناپسند ہوتی ہے تو چھوڑ دیتا ہے۔ اگر ناپسندی سے ایک درجہ بڑھ کر نفرت ہوتی ہے تو اسے دیکھنا یا سننا بھی برداشت نہیں کر سکتا، اگر نفرت سے بڑھ کر دشمنی ہو جاتی ہے تو وہ اسے مٹانے کے درپے ہوتا ہے اور اگر دشمنی سے بڑھ کر اس کے دل میں بغض وعناد کے شدید جذبات پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اس کو مٹانے کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیتا ہے۔ اور اس طرح ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے کہ جب تک اسے صفحہ ہستی سے محو نہ کر دے چین نہیں لیتا۔ اسی طرح جب وہ کسی چیز کو پسند کرتا ہے تو خود اختیار کر لیتا ہے جب محبت کرتا ہے تو آنکھوں سے اس کو دیکھنے اور کانوں سے اس کا ذکر سننے میں مسرت محسوس کرتا ہے، جب محبت سے بڑھ کر عشق کا درجہ آتا ہے تو چاہتا ہے کہ دنیا کے ذرہ ذرہ میں اسی کا جمال ہو اور زندگی کا کوئی لمحہ بھی اس کے غیر کو دیکھنے اور غیر کا ذکر سننے اور غیر کا تصور کرنے میں ضائع نہ ہو۔ پھر اگر یہ عشق فدائیت کی حد تک بڑھ جائے تو وہ اپنی زندگی کو اسی کی خدمت کے لئے وقف کر دیتا ہے، اور اپنی جان ومال، عیش وآرام، عزت وآبرو، غرض سب کچھ اس پر نثار کر دیتا ہے۔ بس امر بالمعروف جو ہماری ڈیوٹی ہے وہ دراصل نیکی سے انتہائی شیفتگی اور والہانہ عشق کا نام ہے۔ اور نہی عن المنکر نام ہے بدی سے انتہائی بغض وعناد کا ------ معروف کا

حکم دینے والا نیک ہی نہیں' بلکہ نیکی کا عاشق و فدائی ہوتا ہے۔ اور نیکی سے روکنے والا صرف بدی سے محترز ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کا دشمن اور اس کے خون کا پیاسا ہوتا ہی۔

اسی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی بنیاد حب انسانیت اور ہمدردی بنی نوع پر بھی قائم ہے۔ خود غرض آدمی کو اللہ جو نعمت دیتا ہے اس میں وہ اکیلا رہنا چاہتا ہے دوسرے کو اس میں شریک نہیں کرتا۔ اسی طرح کوئی مصیبت اس کی اپنی ذات پر آئے تو اسے دفع کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ مگر دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر ان کی مدد نہیں کرتا۔ بخلاف اس کے جو شخص ہمدرد اور محب انسانیت ہو وہ اپنی راحت میں سب کو شریک کرتا ہے' اپنی نعمتیں سب پر بانٹتا ہے اور دوسرے کو درد و مصیبت میں دیکھ کر اسی طرح بیتاب ہو جاتا ہے جس طرح خود اپنے لئے ہو سکتا ہے۔ اس خود غرضی و ہمدردی کو ہم عموماً محسوسات و مادیات کے عالم تک محدود سمجھتے ہیں۔ لیکن اخلاق و روحانیت کے عالم میں ان صفات کا مقابلہ زیادہ سختی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور چونکہ انسان کی مادی بھلائی اور برائی اس کی اخلاقی و روحانی زندگی کے تابع ہے۔ اس لئے ان صفات کا اصلی مقابلہ حقیقتاً اسی عالم میں ہوتا ہے۔ ایک سچا ہمدرد بنی نوع اور محب انسانیت خود نیک بن جانے پر قانع نہیں ہو سکتا' جب تک وہ اپنی انسانی برادری کے دوسرے افراد کو بھی بدی کے پنجہ سے چھڑا کر نیکی کا راستہ نہ دکھادے' اسے اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی روح اپنے دوسرے بھائی کو بدی میں مبتلا دیکھ کر بے چین ہو جاتی ہے۔ وہ دوسرے انسان کو نیکی کے لباس سے عاری دیکھ کر اسی طرح بے قرار ہو جاتا ہے جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو سردی میں سکڑتے ہوئے دیکھ کر بے قرار ہو جایا کرتی ہے۔ اس کو جب کسی چیز کی اچھائی معلوم ہو جاتی ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ سارے انسان اس سے فائدہ اٹھائیں اور جب وہ کسی چیز کی برائی کو جان لیتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کے چنگل میں ایک شخص بھی گرفتار نہ رہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایک چیز اگر اچھی ہے تو وہ صرف میرے لئے ہی اچھی نہیں ہے بلکہ ہر انسان کے لئے اچھی ہے اور میرا فرض ہے کہ اسے آدم کے ہر بیٹے تک پہنچاؤں اور دوسری چیز اگر فی الحقیقت بری ہے تو وہ صرف میرے لئے ہی بری نہیں ہے بلکہ سب کے لئے اس کی برائی یکساں ہے اور لوگوں کو اس سے بچانا میرا فرض ہے۔ اپنی بھلائی پر قناعت کر کے دوسروں کی بھلائی نہ چاہنا'

چاہنا' انہیں بھلائی کی دعوت سے روشناس نہ کروانا اور اپنے سے برائی کو دور کرکے مطمئن ہو جانا اور دوسروں کو اس سے بچانے کی کوشش نہ کرنا سب سے بڑی خود غرضی اور سب سے بڑی انانیت ہے۔

لیکن ہمارے نزدیک یہ صرف خود غرضی ہی نہیں بلکہ خودکشی بھی ہے۔ انسان ایک متمدن ہستی ہے وہ اجتماعیت سے الگ ہوکر زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ اس کی بھلائی اور برائی سب کچھ اجتماعی ہے' اجتماعیت بری ہوگی تو اس کی برائی سے وہ بھی نہ بچ سکے گا۔ اگر ایک شہر میں عام طور پر غلاظت پھیلی ہوئی ہو اور اس سے وبا پھوٹ پڑے تو ہوا کی خرابی صرف اس شخص کو ہلاک نہیں کرے گی جس کے گھر غلاظت موجود ہو' بلکہ وہ صاف ستھرا اور نہانے والا' روز گھر کو صاف کرنے والا' حفظان صحت کے اصولوں کا پورا لحاظ رکھنے آدمی بھی اس سے متاثر ہوگا جو اس شہر میں رہتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی بستی کا عام اخلاق بگڑا ہوا ہو اور وہاں کے لوگ عموماً بدکار ہوں تو اس پر جو تباہی نازل ہوگی وہ صرف بدکاروں تک محدود نہ رہے گی' بلکہ ان چند نیکوکاروں کی عزت و شرافت پر بھی اس کی زد پہنچے گی' جو اس بستی میں مقیم ہوں گے۔ محسن انسانیت ﷺ نے اسی مضمون کو آگے ایک حدیث میں یوں بیان فرمایا ہے۔

"اللہ عام لوگوں پر خاص لوگوں کے عمل کے باعث اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتا جب تک ان میں یہ عیب پیدا نہ ہوجائے کہ اپنے سامنے برے اعمال ہوتے دیکھیں' اور انہیں روکنے کی قدرت رکھتے ہوں (ہاتھ سے' زبان سے' دل سے برا سمجھنا) مگر نہ روکیں' جب وہ ایسا کرنے لگتے ہیں تو پھر اللہ عام اور خاص سب پر عذاب نازل کرتا ہے۔" (مسند احمد)

جب تک ایک قوم میں یہ اسپرٹ موجود رہتی ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کو نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے کا اہتمام کریں' یا کم از کم اس قوم میں ایک جماعت ہی ایسی موجود رہے' جو اس فرض کو مستعدی کے ساتھ انجام دیتی رہے تو قوم کبھی تباہ نہیں ہوسکتی۔ لیکن اگر یہ اسپرٹ ختم ہوجائے اور کوئی جماعت بھی ایسی نہ رہے جو اس فرض کو انجام دینے والی ہو تو رفتہ رفتہ بدی کا شیطان اس قوم پر مسلط

ہو جاتا ہے اور آخر وہ اخلاقی و روحانی اور مادی تباہی کے گڑھے میں ایسی گرتی ہے کہ ابھر نہیں سکتی۔

خالد بھائی یہی وہ جذبات ہیں جو ہمیں اسلامی نظام زندگی کے لئے کام کرنے والے نوجوانوں کو جمعیت کے تحت منظم کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور یہی وہ جذبات تھے جنہوں نے ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کو ایک پوری دنیا سے ٹکر لینے پر آمادہ کیا تھا۔ ہم بھی اپنے آقا اور قائد ﷺ کی طرح جنہوں نے طائف میں پتھر مارنے والوں کے بارے میں فرمایا تھا کہ "میرے اللہ یہ جانتے نہیں' انہیں معاف کر دے۔" کہتے ہیں کہ ہماری قوم بھی ابھی جانتی نہیں' کوتاہی ہماری ہی ہے کہ ہم قوم کو صحیح انداز میں حق سے روشناس نہ کرواسکے۔ اگر ہم یہ کام کرنے میں کامیاب ہوگئے تو انشاء اللہ یہی قوم حق کا دست وبازو بن کر اٹھے گی۔ عرب کے ریگذاروں میں بسنے والی قوم کو اللہ تعالی اگر اسلام کا سپاہی بنا سکتا ہے تو کیا عجب کہ پنجاب کے میدانوں' سندھ کے ریگذاروں اور بلوچستان وسرحد کے پہاڑوں اور جنت نظر کشمیر میں بسنے والی اس قوم کو بھی حق کی شمشیر برہنہ بنا دے۔

انسانیت تبدیلی کے لئے بے چین ہے' حق کو جاننے کی خواہش شدید سے شدید تر ہوگئی ہے۔ ہمارا کام چراغ جلاتے ہوئے انسانیت کی راہنمائی کرنا ہے جمعیت یہ فریضہ انجام دے رہی ہے۔ آیئے ہم اس گروہ میں شامل ہو جائیں۔

اللہ آپ کو حق کا سپاہی بننے کی توفیق بخشے۔ (آمین)

والسلام

ظفر جمال بلوچ

بسم اللہ الرحمان الرحیم

میرے رفیق عزیز!

آپ پر خدا کی سلامتی ہو۔ گزشتہ خط میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اسلامی نظام کے غلبہ کی تڑپ رکھنے والے نوجوانوں کو جمعیت کے تحت منظم کیا جاتا ہے' تاکہ وہ اجتماعی طور پر بدی اور ظلم کے نظام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کا باعث بن سکیں' اس خط میں مجھے جمعیت کے اندرونی نظام تربیت کی ایک جھلک پیش کرنا ہے' تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ جن سے ہم تعمیر گلشن کا کام لینا چاہتے ہیں ان کی تعمیر سیرت کے سلسلہ میں ہماری طرف سے کیا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہی نوجوان تحریک اسلامی کے ہراول دستے کی حیثیت رکھتے ہیں اور انہی کو اقامت دین کی عمارت کی بنیادی اینٹیں بننا ہو گا۔ اگر یہ اینٹیں کمزور اور بودی ہوں گی تو ان کے سہارے تعمیر ہونے والی عمارت بھی بودی اور کمزور ہو گی اور زمانے کے گرم و سرد کا مقابلہ زیادہ دیر نہ کر سکے گی۔ وہ لوگ جو ہر رنگ میں رنگے جائیں' اور ہر ماحول میں جذب ہو جائیں' کسی بھی نظریاتی تحریک کے لئے کبھی مفید ثابت نہیں ہوئے' نظریاتی تحریکوں کا اصل سرمایہ پختہ سوچ' پختہ سیرت اور پختہ کردار رکھنے والے افراد ہی ہوتے ہیں' جنہیں خریدنے' دبانے اور جھکانے کے بارے میں نہیں سوچا جا سکتا جو جہاں جاتے ہیں' اپنے تحریکی مزاج کے اثرات لے کے جاتے ہیں اور جہاں سے آتے ہیں اپنے اثرات چھوڑ کر آتے ہیں۔ جن سے مل کر آنے والے نقد دل ہار کر ہی آتے ہیں جو ہر جگہ اور ہر ماحول میں اپنی تحریک کا چلتا پھرتا نمونہ اور اس کے سفیر ہوتے ہیں۔ لوگ ان کی عادات واطوار ان کے مزاج ان کے چال چلن اور ان کے رکھ رکھاؤ کو دیکھتے ہوئے ان کی تحریک کے بارے میں کوئی رائے قائم کیا کرتے ہیں۔ جن کے کیریکٹر کے اندر مقناطیسی کشش ہوتی ہے' جو افراد کو اپنے سے دور پھینکنے کے بجائے اپنی طرف کھینچتی ہے' اور ان کے رویے کا کھرا پن لوگوں کے دل موہ لینے کا باعث بنتا ہے۔ باطل کے پجاری ان سے بات کرتے ہوئے گھبراتے اور اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونستے ہوئے ان کے پیش کردہ کلام سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں' وہ کلام کان کے پردے

سے ٹکراتا نہیں کہ دل میں نقش ہو جاتا ہے' کیونکہ اس کلام کی پشت پر کارکن کا اخلاص' سوز و گداز اور جذب و کیف کی دولت لازوال ہوتی ہے۔

یہ دور جس سے ہم گزر رہے ہیں علم و مشاہدے کا دور ہے یہاں دلیل سے بات کی جاتی ہے اور دلیل ہی سے بات کو سنا جاتا ہے۔ محض جذبات کا جوار بھاٹا لوگوں کو متاثر نہیں کر سکتا۔ ہاں البتہ ان کے دلوں کی دنیا میں اضطراب ضرور پیدا کر سکتا ہے' اور ظاہر ہے کہ اضطراب کی کیفیت دیرپا نہیں ہو سکتی' نہ ہی مستقل بنیادوں پر کسی کی زندگی کو تبدیل کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔ کوئی فرد اگر سراپا تحریک بن سکتا ہے یا اسے دلیل کے ہتھیار فراہم ہو سکتے ہیں تو صرف اسی صورت میں جب وہ دعوت کو سمجھ چکا ہو' شعوری طور پر دعوت کو سمجھنے کی صورت میں بڑی سے بڑی قربانی بھی دی جا سکتی ہے۔ لیکن جذباتی وابستگی کی صورت میں دو چار قدم چل لینا ہی غنیمت ہوتا ہے۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ دعوت کو شعوری طور پر قبول کر لینے کی صورت میں لوگوں نے موت کے جام کو بھی جام صحت سمجھ کر پیا ہے۔ سقراط نے اپنی دعوت کو شعوری طور پر جان لیا تو پھر زہر کا پیالہ پیتے ہوئے بھی اس کے قدم نہ لڑکھڑائے۔ امام مالک ؒ پر اپنے مسلک کی سچائی آشکارا ہو گئی تو انہوں نے اپنے بازو اکھڑوانا قبول کر لیا' لیکن اس کے لئے تیار نہ ہوئے کہ ان کی موجودگی میں دین کی عمارت کی کسی ایک اینٹ کو بھی اکھیڑ دیا جائے' یا اپنے مخصوص مقام سے ادھر ادھر کھسکا دیا جائے۔ امام حسین ؓ نے جب اپنے مسلک اور استدلال کی مضبوطی کے بارے میں اطمینان کر لیا تو کربلا کی تپتی ہوئے ریت اور اپنے معصوموں کی تڑپتی ہوئی لاشیں بھی انہیں گریز کی راہوں پر نہ ڈال سکیں۔

سید قطب شہید ؒ پر جب حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی تو انہوں نے وقت کے جباروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہا کہ "تمہیں اگر میرے سر کی ضرورت ہے تو اسے میں ہتھیلی پر رکھ کر لایا ہوں۔" امام احمد سرہندی ؒ نے حقیقت آشکارا ہونے پر گوالیار کے قلعہ میں نظر بند ہونا تو قبول کر لیا لیکن اپنے افکار کو محبوس دیکھنا گوارہ نہ کیا۔ ان کے افکار آزاد رہے اور انہیں زنجیریں نہ پہنائی جا سکیں۔ یہ دعوت کو جاننے اور شعوری طور پر قبول کرنے ہی کا نتیجہ تھا کہ دہکتے ہوئے انگاروں پر بھی احد احد کی وجد آفریں صدائیں گونجتی رہیں۔ اپنے بر سر حق ہونے ہی کا یقین تھا جو

ایک باندی کو بھی یہ کہنے کی جرات بخشتا ہے کہ "عمریا تو اسلام قبول کر لو ورنہ میرا خدا تم سے انتقام لے گا۔" یہ کیفیات علم اور یقین کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتیں اور ان کیفیات کو پیدا کئے بغیر کوئی فرد وادی عشق میں دو چار گام بھی نہیں چل سکتا۔ کیونکہ

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کا یہ کام ہی نہیں

اسلامی جمعیت طلبہ چونکہ ایک نظریاتی تحریک ہے' اس لئے یہ اپنے پرچم تلے جمع ہونے والے نوجوانوں کے محض جوش و جذبے سے ہی کام نہیں لیتی' بلکہ فکری بنیادوں پر بھی ان کے اندر پختگی پیدا کرنے کا اہتمام کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں جمعیت کا کام ہے وہاں جمعیت کی لائبریریوں میں آپ کو وسیع پیمانے پر لٹریچر بھی نظر آئے گا۔ جس کے مطالعہ کی صورت میں جہاں کارکن دعوت کی اصل حقیقت اس کے مطالبات' اس کے لوازمات اور اس کی ضروریات سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے وہاں باطل نظریات کی تاریخ' ان کی خرابیاں' ان کی کمزوریاں اور ان کے بودے پن سے بھی آگاہی حاصل کرتا ہے۔ اسی لٹریچر کے مطالعہ کے نتیجہ میں اسے اسلامی ریاست کے خدو خال اور نقشے سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یہیں سے اسے تعمیر سیرت کے سلسلہ میں وسائل میسر آتے ہیں' یہیں سے اسے یقین و اعتماد کی وہ دولت ملتی ہے جس کی بنا پر اسے زندگی کے کسی موڑ پر بھی اپنی تہی دامنی کا احساس نہیں ہوتا اور کسی موقع پر بھی اس کے قدم صراط مستقیم سے ڈگمگاتے نہیں۔ لٹریچر کا مطالعہ جہاں کارکنان انفرادی طور پر کرتے ہیں وہیں اسٹڈی سرکلز کی صورت میں اجتماعی مطالعہ کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے' تاکہ دوران مطالعہ میں اگر کہیں ابہام پیدا ہو تو باہمی مطالعہ کی صورت میں مل جل کر اسے دور کیا جاسکے۔ اسی طرح مطالعہ کو عمل کے قالب میں ڈھالنے کے لئے تربیت گاہوں' شب بیداریوں اور مجالس ذکر کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ جہاں درس ہائے قرآن وحدیث اور تزکیہ نفس سے متعلق تقاریر کے نتیجہ میں کارکنان کے اندر کے انسان کو بیدار کرنے اور اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہیں مغربی افکار اور اسلام کا تقابلی مطالعہ بھی لیکچرز کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے' تاکہ جمعیت کے کارکنان اس ماحول سے بھی آگاہی حاصل کریں جسے تبدیل کرنا ان کی ذمہ داری ہے اور جس ماحول میں رہتے

ہوئے انہیں اپنی دعوت کو پھیلانے اور عام کرنے کا کام کرنا ہے۔ وقفے وقفے سے ہونے والے یہ پروگرام کارکنان کی زنگ خوردگی کو ختم کرتے ہوئے ان کے قدموں کو تیز کرنے کا باعث بنتے ہیں' ان کے اندر خشیت الٰہی پیدا کرتے' اور انہیں اللہ کے رنگ میں رنگے جانے کے لئے مطلوبہ ماحول فراہم کرتے ہیں۔ اگر کوئی فرد اس نظام تربیت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تو قصور نظام تربیت کا نہیں' بدقسمتی اس فرد کی ہے۔ اگر کوئی جاں بہ لب چشمے کے کنارے پہنچ جانے کے باوجود بھی پیاس بجھانے کی کوشش نہیں کرتا تو اس میں چشمے کا کوئی قصور نہیں' استفادہ نہ کرنے کی صورت میں ہلاکت اس کا مقدر ہوگی چشمے کا کچھ نہ بگڑے گا۔

تربیت گاہوں اور شب بیداریوں وغیرہ کے ساتھ ساتھ ہفتہ وار اجتماعات عام و کارکنان نیز احتسابی میٹنگز بھی بہت حد تک اس ماحول کے پیدا کرنے اور باقی رکھنے میں مفید ثابت ہوتی ہیں۔ رہی سہی کسر معاشرے کی احتسابی نظریں پوری کر دیتی ہیں۔ یہاں ہر آنکھ ہمارے کارکن کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کرتی ہے' کہیں دامن پر کوئی دھبہ دیکھتی ہے تو فوراً انگلی اٹھاتی ہے' اس کا یہ انگلی اٹھانا کارکنان کو اپنی کمزوریوں سے آگاہ ہونے اور انہیں دور کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ چاروں طرف سے ہونے والے تبصرے' تنقیدیں اور مخالفت کا اس تیزی سے طوفان اٹھتا ہے کہ بعض افراد اس کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا بیٹھ رہنا مفید ہے' کہ اس قسم کے تھوڑدلے لوگوں کی اس کام کے لئے ضرورت ہی نہیں' یہاں تو شیر کا دل اور چیتے کا جگر چاہئے۔ جو لوگ اس طوفان کا مقابلہ جرات سے کرتے ہیں انہیں معاشرہ یوں چمکا دیتا ہے جیسے کئی ہاتھ بیک وقت ایک دیگچی کی کالک کو مانجھتے ہوئے صاف شفاف برتن میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

علم اور تربیت دونوں لازم و ملزوم ہیں' بے عمل فرد کا علم دوسروں کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتا۔ بلکہ الٹا یہی علم اس کے لئے خدا کے ہاں حجت ثابت ہو گا۔ پھر عمل کے بغیر لہجے میں وہ دل سوزی' رقت اور اخلاص پیدا نہیں ہوتا' جو لوگوں کے اذہان اور ان کے دلوں کو دعوت کی طرف راغب کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے ان دونوں کے اندر توازن اور ربط کا پایا جانا نہایت ضروری ہے' لیکن اس علم اور تربیت

کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ کارکنان کی دیگر خوابیدہ صلاحیتوں کو بھی اجاگر کرنے کا اہتمام کیا جائے خواہ وہ تقریری صلاحیتیں ہوں' خواہ وہ ادبی صلاحیتیں ہوں' اور خواہ وہ جسمانی صلاحیتیں ہوں' پہلی دونوں قسم کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے اسپیکرز فورم اور ادبی مجالس قائم کی جاتی ہیں' جب کہ جسمانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے مختلف مقامات پر کھیلوں اور ورزشوں کا اہتمام بھی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے' تاکہ جمعیت کا کارکن ذہنی و ایمانی صحت کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت کا بھی خیال رکھ سکے۔ کیونکہ ذہنی اور ایمانی طاقت کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت کی بھی بدرجہ اتم ضرورت ہے۔ مریل جسم رکھنے والے اور گردنیں جھکا کر چلنے والے دنیا میں کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکتے' دنیا میں ہمیشہ وہی لوگ کوئی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جنہیں باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جرات حاصل ہوئی اور جنہوں نے اپنی گردن کا کٹنا تو گوارا کر لیا لیکن سوائے خدا کے کسی کے بھی سامنے اپنی گردن خم کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے سے بھی یہی حقیقت ہمارے سامنے واضح ہوتی ہے کہ اسلام کی دعوت تو آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی' لیکن اسے وزن اسی دن حاصل ہوا جب حضرت عمرؓ نے باطل کے مقابلے میں گردن اکڑاتے ہوئے تلوار کو نیام سے نکال کر ہوا میں یہ کہتے ہوئے لہرایا تھا کہ

"میں اسلام قبول کر چکا ہوں' جسے مرنا پسند ہے وہ میرے مقابلے میں آسکتا ہے۔"

جمعیت بھی اس حقیقت سے آگاہ ہے' یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے پروگرام میں وسیع مطالعہ اور سیرت و کردار کی تعمیر کے ساتھ ساتھ ہی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کی نشوونما کا موثر انتظام کرنا بھی شامل کیا ہے۔ اور گزشتہ چھبیس ستائیس سالوں سے انہی بنیادوں پر کام کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں' اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جمعیت کے دھان پان اور سنگل پسلی کارکنان بھی ------

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

کی عملی تفسیر نظر آتے ہیں۔ یہ صبر و رضا کے پیکر ہیں' لیکن کوئی انہیں مٹی کے مادھو

سمجھتے ہوئے چھیڑنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر ان کے ہاتھ اٹھتے ہیں تو بجلی بن کر گرتے ہیں۔ اقبال نے شاید انہی کے بارے میں کہا تھا کہ

اسلام کے شیروں کو نہ چھیڑنا تم ورنہ
تکبیر کے نعروں سے دنیا کو ہلا دیں گے

باتیں بہت ہو گئیں ---- اب رخصت چاہتا ہوں ---- اچھا خدا حافظ

والسلام
ظفر جمال بلوچ

بسم اللہ الرحمان الرحیم

برادرم خالد!

آپ پر خدا کی سلامتی ہو۔ آپ کا ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ قبل کا لکھا ہوا خط آج موصول ہوا' شاید حکمرانوں کے مقرر کردہ منکر نکیر اس میں سے کسی خطرے کی بو کو سونگھنے کی کوشش کرتے رہے ہوں۔ بہرحال اس خط کو پڑھنے سے یہ اطمینان ضرور ہوا کہ میرے خطوط آپ کو مل رہے ہیں' اور ان خطوط نے آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ماضی میں جس انداز سے تعلقات رہے ہیں بلکہ میں تو اب بھی ان میں کوئی کمی محسوس نہیں کرتا ان کی بنیاد پر پہلے ہی خط میں آپ کو جمعیت میں شمولیت اختیار کرنے کی دعوت دے سکتا تھا لیکن میں نے اس ضمن میں دوستی اور تعلقات کے حوالے دے کر آپ کو ادھر آنے کی دعوت دینے کے بجائے یہی مناسب سمجھا کہ جمعیت کے پروگرام اور اس کی دعوت کے تمام تر گوشوں سے آپ کو روشناس کروانے کی کوشش کروں۔ تاکہ اگر آپ ادھر آئیں تو تعلقات کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے نہ پہنچیں' بلکہ ذاتی غور وفکر اور دل و دماغ کے متفقہ فیصلہ کے نتیجہ میں ادھر کا رخ کریں۔ ورنہ جہاں تک خواہش کا تعلق ہے اس سے بڑھ کر میری خواہش کیا ہو سکتی ہے کہ میرا وہ ساتھی جس کے ساتھ میں نے مل کر مستقبل کے حسین خواب دیکھے تھے اور جس کے ساتھ زندگی کا ایک عرصہ گزرا ہے۔ وہ اس نظریاتی میدان میں بھی میرا دست و بازو ثابت ہو' ہم مل کر اپنے سینوں کو زخموں کے لئے پیش کریں' ہماری خوشیاں مشترکہ ہوں اور ہمارے دکھ و غم بھی مشترکہ ہوں۔

آپ جیسا قلب سلیم اور فطرت حنیف رکھنے والا فرد اگر ابھی تک دین کے تقاضوں سے نابلد رہا ہے تو اور بہت سارے محرکات کے ساتھ اس کی بنیادی وجہ یہ بھی رہی ہے کہ آج تک اس ملک کے نظام تعلیم کو نظریاتی رنگ دینے کی کوشش نہیں کی گئی اور جب تک اس ملک کے نظام تعلیم کو ملی روایات واقدار سے ہم آہنگ نہ کیا گیا اس وقت تک نجانے کتنے خالد فطرت سلیم رکھنے کے باوجود دینی تقاضوں اور مطالبات سے ناواقف رہیں گے۔

کتنے دکھ کی بات ہے کہ وہ نظام تعلیم جو انگریز نے محض مسلمانوں کے جذبہ خودی کو کچلنے اور ان میں کلرکانہ ذہنیت پیدا کرنے کے لئے وضع کیا تھا' آزادی حاصل کرنے کے باوجود آج تک ہماری گردنوں پر مسلط ہے۔ یوں تو انگریز چل دیا لیکن اس نظام کی صورت میں اس کی آقائیت برقرار ہے۔ اور ستائیس برس گزرنے کے باوجود موجودہ نظام تعلیم انگریزوں کے لئے وفادار اور ذہنی طور پر مرعوب افراد مہیا کرنے کی فیکٹری کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ قومیں اگر سیاست کے میدان میں کبھی شکست کھا جائیں تو تعلیمی اداروں کی چار دیواریاں ان کے لئے آخری پناہ گاہیں ثابت ہوتی ہیں' جہاں پروان چڑھنے والی نسل اپنے آباؤ اجداد کے ہزیمت کے داغ اپنے جوش عمل سے دھوتی ہے۔ لیکن اگر پناہ گاہوں کے اندر نظریاتی ماحول نہ ہو اور ان کے ارد گرد نظریاتی طور پر مستحکم فصیل موجود نہ ہو تو پھر قوموں کو یہاں بھی تحفظ حاصل نہیں ہوتا اور ایسی قومیں بہت جلد صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا کے رکھ دی جاتی ہیں۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہمارے اکابرین کی پہلی ذمہ داری یہی تھی کہ اپنے مستقبل کا تحفظ کرتے جو نوجوانوں کی صورت میں موجود تھا۔ انہیں وہ لٹریچر مہیا کیا جاتا جس میں پاکیزگی ہوتی' انہیں وہ اساتذہ مہیا کئے جاتے جو صاحب کردار اور اسلامی نظریات پر پختہ ایمان کے حامل ہوتے' ان کے لئے وہ نصاب مرتب کیا جاتا جس سے وہ قافلہ آزادی کی حکایت خونچکاں سے واقف ہوسکتے' اور انہیں علم ہوتا کہ آزادی کی قیمت کے طور پر ان کی بہنوں کے ننگے جلوس نکالے گئے ہیں' ان کے چھوٹے چھوٹے بھائیوں کو نیزوں کی انیوں پر اچھالا گیا ہے' ان کے بوڑھے والدین کو برچھیوں اور بھالوں کی زد میں رکھا گیا اور جلتے الاؤ میں پھینکا گیا' ان کی ماؤں کے پستانوں کو کاٹ ڈالا گیا' اور ان کی معصوم بہنوں کی عزت و عفت کے لباس کو تار تار کیا گیا' جنہیں چشم فلک نے بھی کبھی ننگے سر نہ دیکھا تھا اور ان مظالم کے سلسلہ میں ہندو سکھ کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ دونوں طرف سے تلواریں اور کرپانیں لہرائی جارہی تھیں اور ایک ہی نعرہ سنائی دیتا تھا کہ "مسلوں کو ختم کر ڈالو"۔ اور ان دنوں اہنسا کے جھوٹے پجاریوں کی پیاس خون مسلم ہی سے بجھ رہی تھی۔ یہ تفصیلات ہی نسل نو پر آزادی کا دولت لازوال ہونا ثابت کر سکتی تھیں' اور انہی کے نتیجہ میں یہ نسل اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز کرنے کے قابل ہو سکتی تھی

اور آج کسی میں یہ جرات پیدا نہ ہوتی کہ اس نسل کی موجودگی میں اندرا گاندھی سے تین پشتوں سے رشتہ داری کے تعلقات کو جتاتا' کسی میں ہمت نہ ہوتی کہ ہندوستان کے ساتھ کنفیڈریشن کا ذہن لے کر میدان سیاست میں قدم رکھتا اور کسی میں یہ مجال نہ ہوتی کہ پاکستان کے قیام کو غیر فطری قرار دیتا۔ اسی علم کی بنا پر آج کی نسل آپکو بیل باٹم میں ملبوس بازاروں اور گلیوں میں دختران حوا کے تعاقب میں سیٹیاں بجاتی نظر نہ آتی' بلکہ میدانوں میں تربیت دیتی اور تربیت لیتی نظر آتی۔ نوجوان ہمیشہ سیٹیاں تبھی بجایا کرتے ہیں' اور لمبی تان کر بھی سویا کرتے ہیں جب انہیں ارد گرد کے ماحول سے "سب اچھا" کی آواز سنائی دے۔ قصور اس نسل کا نہیں ہے' اسے کس نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ "نوجوانو! تمہارے ملک کی بنیاد تمہارے ہی بزرگوں اور تمہاری ہی بہنوں کی تڑپتی لاشوں پر رکھی گئی ہے۔ کس نے بتایا کہ یہ ملک محسن انسانیت کے نام پر اور انہی کے نظام کے غلبہ کے لئے حاصل کیا گیا' دیکھنا یہ ملک جو اسلام کی امانت ہے' اس میں خیانت نہ ہونے پائے' دیکھنا عیار دشمن تمہاری بے خبری و مدہوشی کے نتیجہ میں کہیں تم سے آزادی کی نعمت چھین کر غلامی کی زنجیروں میں نہ جکڑ لے------؟"

یہاں تو پاکستان اور انڈیا کا دو مملکتوں کی حیثیت اختیار کرنا معاشی تحفظ کی بنیاد ثابت کیا گیا۔

یہاں تو مشرقی پاکستان کو معیشت پر بوجھ ظاہر کیا گیا۔

یہاں مسلمانوں کو پانچ قومیتوں میں نصابی سطح پر بھی تسلیم کیا گیا اور اس کا پرچار بھی کیا گیا۔

یہاں راجہ داہر کو مظلوم اور مسلمانوں کو غاصب کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ یہاں معاشرے کی بنیاد زبان' رنگ' علاقہ اور نسل کو قرار دیا گیا----- یہاں ڈارون کے نظریے کو متعارف کروایا گیا' یہاں کارل مارکس کو عظیم مفکر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ----- یہاں اردو ادب کے نام پر فحش اور لچر چیزوں کو نصاب میں شامل کرتے ہوئے نوجوانوں کو عیاشی کی افیون کھلانے کی کوشش کی گئی اور ان کے جنسی و سفلی جذبات کو بھڑکانے کا اہتمام کیا گیا----- یہاں حضرت ابوذر غفاری ﷺ کو سب سے بڑا سوشلسٹ قرار دیا گیا----- یہاں نام نہاد ترقی پسند ادب کے نام پر طبقاتی کش مکش کو

زیادہ سے زیادہ ابھارا گیا ---- یہاں سود کو معیشت میں ریڑھ کی ہڈی اور بنیادی عامل قرار دیتے ہوئے عملاً اسلام کے نظام معیشت کی نفی کی گئی ----- یہاں حساب کے سوالات میں ملاوٹ اور بے ایمانی کو نفع کا نام دیتے ہوئے نوجوانوں کو اسی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی ----- یہاں مخلوط نظام تعلیم کو رائج کرتے ہوئے رہے سہے اخلاق اور رہی سہی مشرقی روایات کا بھی جنازہ نکالنے کی کوشش کی گئی -----

آج کسی کو کلرک مقرر کرنا ہو تو اس کے لئے بھی کیریکٹر سرٹیفکیٹ کا پیش کرنا ضروری ہے۔ لیکن جن کے ہاتھ میں قوم کا سرمایہ اور قوم کی متاع دنی جاری تھی ان کے کیریکٹر کے بارے میں اطمینان کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی گئی' کئی اساتذہ کے کمرے عیاشی کے اڈوں میں تبدیل ہوگئے اور آج بھی وہ عملاً عیاشی کے اڈوں ہی کا نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ یہاں ایسے لوگوں کو بھی تعینات کیا گیا جو خدا کے وجود کے منکر تھے جن کا فلسفہ یہ تھا کہ چودہ سو سال کا طویل عرصہ گزرنے کی بناء پر تعفن کی نذر ہو چکا ہے' جن کی ذہنی وابستگی پیکنگ' ماسکو اور واشنگٹن سے تھی' انہوں نے یہی ذہن تعلیمی اداروں میں بھی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ تمام تر باتیں تعلیمی اداروں کے ماحول اور ہمارے نصاب سے متعلق ہیں۔ اس لئے باہر کے ماحول کا میں نے جان بوجھ کر ذکر نہیں کیا' یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت اس نوجوان نسل کو ذہنی غسل دیئے' اس کا اخلاقی دیوالیہ نکالنے اور ایمانی بنیاد پر اس کو قتل کرنے کی ایک گھناؤنی سازش کی گئی۔ اور آج بھی اس سازش کو روا رکھا جارہا ہے' لے دے کر اسلامیات کو میٹرک تک ایک لازمی مضمون کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے میخانے کے ایک کونے میں چھوٹی سی مسجد بھی تعمیر کر دی جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ پورے میخانے کو مسجد میں تبدیل کیا جائے' لیکن جواباً کاروائی یہ کی جاتی ہے -------

اب میں پوچھتا ہوں کہ اس صورت میں وحدانیت اور اسلامیت کا تصور مجروح ہوگا یا نہیں؟ کیا لسانی' علاقائی اور نسلی فتنے سر اٹھائیں گے یا نہیں؟ اور وہ نسل جسے آپ نشان منزل ہی نہیں بتائیں گے' وہ اپنے آباؤاجداد کے ورثے کی حفاظت بھی کر سکے گی؟

اسلامی جمعیت طلبہ نے اس خرابی کے دور رس نتائج اور اثرات کو اول روز سے ہی محسوس کر لیا تھا' یہی وجہ ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کی جگہ اسلامی نظام تعلیم کو رائج

کروانے کو ایک مطالبے کی صورت میں اول روز سے ہی اپنے پروگرام میں شامل کر لیا۔ اس پورے عرصہ میں ہم قراردادوں کے ذریعے' مذاکرات کے ذریعے' میمورنڈم کے ذریعے' جلسوں اور جلوسوں کے ذریعے اور وفود کی صورت میں ملاقاتیں کرتے ہوئے اس مسئلہ کی نزاکت سے جہاں کارپردازان حکومت کو آگاہ کرتے رہے ہیں' وہیں ہم نے ملک کے فہمیدہ اور سنجیدہ طبقہ کو اسلامی نظام کی اثرانگیزی کا قائل کیا' اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب یہ مسئلہ صرف ایک طلبہ تنظیم کا مسئلہ نہیں' بلکہ اس مسئلہ نے ایک ہمہ گیر حیثیت اختیار کر لی ہے' حکمران خواہ ذہناً اس تبدیلی کے لئے تیار نہ ہوں لیکن اپنے بیانوں اور تقاریر کی حد تک اب یہ ضرور کہتے ہیں کہ نظام تعلیم کو مقصدی ہونا چاہئے' اسلامی ہونا چاہئے اور مفید ہونا چاہئے۔ ہم مخلوط تعلیم کی لعنت کو بھی فی الحال مکمل طور پر ختم کروانے میں کامیاب نہیں ہو سکے' لیکن یہ ضرور ہوا کہ مسلسل دباؤ اور مطالبات کے نتیجہ میں پنجاب کی طرح سندھ میں بھی طالبات کے لئے الگ سے ایک میڈیکل کالج قائم کر دیا گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جیسے جیسے ہماری قوت میں اضافہ ہو گا اسی انداز سے ہمارا دباؤ بھی بڑھتا جائے گا اور ایک وقت وہ آئے گا جب ذمہ داران حکومت کو اس مطالبہ کے سامنے جھکنا ہی پڑے گا۔

ہم جب اسلامی نظام تعلیم کی بات کرتے ہیں تو بعض تنگ نظر لوگ فوراً ملائیت کا الزام عائد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس ترقی یافتہ دور میں ان کی طرف سے طالب علموں کے ہاتھ "بغدادی قاعدہ" تھمانے کی سازش کی جا رہی ہے' لیکن حقیقت سے اس کو دور کا واسطہ بھی نہیں۔ ہم جس اسلامی نظام تعلیم کی بات کرتے ہیں وہ سائنٹیفک بھی ہے' ہمہ گیر بھی ہے اور سہل الحصول بھی ہے۔ اگر سرمایہ دارانہ اور سوشلسٹ نظام رکھنے والے ممالک نظام تعلیم کو اپنی ضروریات سے ہم آہنگ کر سکتے ہیں تو ہم یہ کام کیوں نہیں کر سکتے۔ ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ آپ طالب علم کو تمام مضامین پڑھایئے لیکن اس کی فکر کو مسلمان رہنے دیجئے اور فکر تبھی مسلمان رہ سکے گی جب پورے نظام تعلیم پر اپنے نظریئے کی چھاپ ہو گی' اسی کا غلبہ ہو گا۔ اس نتیجے میں معاشرہ کو ملنے والے وکیل' مجسٹریٹ' تھانیدار' ڈاکٹر' انجینئر اور جرنیل بھی پہلے شعوری مسلمان ہوں گے اس کے بعد ہی وکیل' مجسٹریٹ' تھانیدار' ڈاکٹر' انجینئر اور جرنیل ہوں گے۔

ہم جہاں طلبہ کی ذہنی نشوونما اور ترقی میں حائل غلط نظام تعلیم کو بدلوانا چاہتے ہیں وہیں طلبہ کی عمومی نوعیت کی مشکلات کو بھی دور کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ خواہ ان کا اجتماعی معاملہ ہو یا انفرادی' جمعیت کے کارکنان ہر جگہ طلبہ کی مدد اور ان کی رہنمائی کے لئے موجود ہوتے ہیں۔ فولنگ کی لعنت کو ختم کروانے سے لے کر غریب طلبہ کی فیسوں' کتابوں' کپڑوں اور نوٹس تک کے سلسلے میں اپنے وسائل اور حالات کے مطابق مدد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاکہ محض غربت کسی ذہین طالب علم کے پاؤں کی زنجیر ثابت نہ ہو۔ ہماری یونینز نے قریبا ہر جگہ طلبا کے تعاون سے ان کے مسائل کو حل کروانے کی بھرپور کوششیں کی ہیں۔ باوجود اس کے کہ انتظامیہ نے ہر جگہ روڑے اٹکانے کی کوشش کرنا اپنا فرض منصبی سمجھا۔ پھر یہ جمعیت ہی ہے جس نے طلبہ کی سیاست کو بیرونی سیاست کے اثرات سے محفوظ رکھا اور نتیجتہ طلبہ کو استعمال کرتے ہوئے اپنا الو سیدھا کرنے والی پارٹیوں کو منہ کی کھانا پڑی' آج طلبہ فکری اور ذہنی لحاظ سے آزاد ہیں' اور ان کی سوچ کی باگیں کسی سیاسی قیادت کے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب طلبہ پہلے کی نسبت اپنے اندر زیادہ خود اعتمادی محسوس کرتے ہیں' زیادہ ملکی معاملات و مسائل پر نظر رکھتے ہیں' اور ملک کے بگاڑ پر زیادہ کڑھتے ہیں۔ یہ نسل حال سے پریشان ضرور ہے' لیکن مستقبل سے مایوس نہیں' یہی انداز فکر وقت آنے پر نوجوانوں کو اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے' اور یہ کریڈٹ جمعیت ہی کو ملتا ہے کہ اس نے یہ انداز فکر پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی اور مسلسل کوشش کر رہی ہے۔ کبھی وقت کے مورخ کو اگر ہماری قوم کی تاریخ لکھنے کا موقع ملا تو وہ جمعیت کے مثبت اور انقلابی رول کو نظرانداز نہ کر سکے گا۔

میرے دوست ہم نے بہاروں کی خاطر اپنے بچھلے جوانوں کا گرم گرم اور جوان خون پیش کیا ہے' مجھے یقین ہے کہ اس ملک کا مقدر بہار ہی ہے لہٰذا

ہمیں بھی یاد کر لینا چمن میں جب بہار آئے

والسلام

ظفر جمال بلوچ

بسم اللہ الرحمان الرحیم

برادر عزیز!

السلام علیکم۔ آج ہی آپ کا خط موصول ہوا' محسوس ہوتا ہے کہ میری دوبارہ نظر بندی پر آپ اچھے خاصے جذباتی ہوچکے ہیں' مجھے اس کا احساس آپ کے خط کو پڑھنے سے ہوا۔ میں آپ کو گزشتہ خطوط میں بھی لکھ چکا ہوں کہ یہ آزمائشیں ان شاء اللہ ہمیں جانب منزل پیش قدمی کرنے سے نہیں روک سکیں گی' بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جب تک اس ملک میں اسلامی نظام کو غلبہ نصیب نہیں ہوتا اس وقت تک یہ پورا ملک ہمارے لئے جیل خانے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے بڑی جیل سے چھوٹی جیل میں کبھی کبھار منتقلی ہمارے اعصاب کو متاثر نہ کر سکے گی۔ البتہ مخالفت کے زعم میں جس بڑے پیمانے پر اس ملک میں قانون کی مٹی پلید کی جارہی ہے اور قانون کی مشینری کو جام کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں' اس سے دکھ ضرور ہوتا ہے کہ آخر اس ملک کا مستقبل کیا ہوگا' کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ جب کسی آمر نے لوگوں کے جذبات کے اظہار کو غیر فطری طریقے سے روکنے کی کوشش کی اس کے رد عمل کے طور پر پورا معاشرہ انارکی کے راستہ پر جانکلا۔ سوچتا ہوں کہ وہ قوم جس نے ستائیس سال قبل بڑی تمناؤں' آرزوؤں اور امیدوں کے سہارے پاکستان کے قیام کی صورت میں اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کیا تھا' آج اس کی تمناؤں کا خون کیوں ہوا ہے' آج س کی آرزوؤں کا گلا کیوں گھونٹ دیا گیا ہے؟ آج اس کی امیدوں کے چراغوں کو کیوں بجھادیا گیا ہے؟ یہ اہتمام تو کسی گھر کو لوٹنے سے پہلے کیا جاتا ہے' کہیں میرے پیارے وطن اور میرے گھر کو بھی لوٹنے کی سازش تو نہیں کی جارہی؟ کہیں راہزنوں کے ہاتھوں میں تو قیادت کی باگیں نہیں تھمادی گئیں' کیونکہ ایسے ماحول کو ایسی فطرت اور قماش کے لوگ ہی برداشت کر سکتے ہیں۔ آزادی اور جمہوریت کی فضا میں اس ذہنیت کے حامل لوگوں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ میں ارد گرد دیکھتا ہوں کہ شاید کہیں سے جواب مل جائے' مگر جواب نہیں ملتا' اور جواب ملے بھی تو کیسے کہ میرے چاروں طرف موت کا سناٹا ہے' لوگ موجود ہیں مگر ان کے ہونٹ سلے ہوئے ہیں۔ آخر چارہ کار کے طور پر میں اپنے ضمیر کو پکارتا ہوں کہ شاید اس کی طرف سے

راہنمائی ہو' ضمیر مجھے مایوس نہیں کرتا ------ اور ضمیر نے کبھی کسی کو مایوس کیا بھی نہیں' یہ الگ بات ہے کہ انسانوں نے ضمیر کو بری طرح مایوس کیا ہے ------ میرے ضمیر نے میرے پکارنے پر سہمے ہوئے اور ڈرے ڈرے انداز میں اثبات میں سرہلایا کہ ہاں ماحول میں گھٹن اسی بنیاد پر ہے کہ گھٹن اور حبس کو کشادگی اور آزادی کا نام دینے والے لوگ بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اور جب تک ان کی شرح میں کمی نہ ہوگی یہ حبس اور گھٹن بھی ختم نہ ہوسکے گی۔

رفیق من! یہ حبس اور گھٹن پیدا نہیں ہوئی بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اسے قوم پر مسلط کیا گیا' تاکہ قوم کے اندر بیداری کے جراثیم پنپ نہ سکیں' اور وقت کے امیر و سلطان کا احتساب نہ ہوسکے۔ ان کی اعتدال کی حدود کو پھلانگتی ہوئی سرگرمیوں پر معاشرے کی طرف سے کوئی قدغن نہ لگائی جاسکے' یہ کام کرنے کے لئے ملک میں طبقہ واریت کو پیدا کیا گیا' تعلیمی اداروں کو تجارتی منڈیوں میں تبدیل کرتے ہوئے آئندہ ملازمتوں اور ترقی کے تمام تر ذرائع امراء کے طبقے کے لئے مخصوص کر دیئے گئے۔ دوسری طرف معاشرے میں عزت و وقار کے لئے تقویٰ و پرہیزگاری کو بنیادی حیثیت حاصل ہونے کے بجائے دولت' جاہ و منصب اور نسب کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی اور تیسری طرف عوام کو سیاسی تربیت سے محروم رکھتے ہوئے چھوٹے چھوٹے مفادات کے نام پر اپنی پارٹیوں اور اپنے دھڑوں کے لئے ان کی خرید و فروخت کا سلسلہ شروع ہوا' جس کے نتیجہ میں سیاست ایک امیر آدمی کا شغل ٹھہری' غربت یہاں بھی درد دل رکھنے والے انسان کے پاؤں کی بیڑی ثابت ہوئی کہ جسے توڑے بغیر اس وادی میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کی جاسکتی تھی' ان حالات میں غریبوں کا کام جھاڑو اٹھانا اور امراء کی جوتیوں کو سیدھا کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہ رہا۔ اگر کسی متوسط درجے کے گھرانہ کا کوئی بچہ کسی طرح زیور تعلیم سے آراستہ ہو بھی گیا تو سفارش کے نہ ہونے کی بنا پر سو روپے کی کلرکی کے لئے بھی ترستا رہا' اور کسی کا گروپ مضبوط اور صاحب وسائل ہوا تو میٹرک فیل کے باوجود کوئی اسے گورنری اور وزارت اعلیٰ کے منصب پر فائز ہونے سے نہ روک سکا۔ اسی کے نتیجہ میں ملک میں احساس محرومی نے جنم لیا' اس ملک کے بدخواہ تو شروع ہی سے اس ملک کی جڑوں کو کاٹنے میں معروف تھے'

اس ملک کا پھلنا پھولنا انہیں گوارا نہ تھا۔ انہوں نے محرومیوں کی ان داستانوں کو موثر ترین پیرائے میں بیان کیا۔ یہ زہر آہستہ آہستہ اندر ہی اندر سرایت کرتا چلا گیا۔ اور ایک وقت وہ آیا جب حقوق کے نام پر بھائی بھائی کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ بھائی نے بھائی کی گردن کو توڑا۔ اس کے گھر کو آگ لگائی اور اس کی عزت و حرمت کو اپنے لئے جائز سمجھا۔ اسی حقوق کی جنگ نے مشرقی پاکستان کی جدائی کا صدمہ ہمیں سہنے پر مجبور کیا۔ آج یہی حقوق کی جنگ مغربی پاکستان میں بھی اپنے دائرہ اثر کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ حقوق کی جنگ اور محرومیوں نے اس غلط نظام کی کوکھ سے جنم لیا ہے جو ستائیس سالوں سے کسی نہ کسی انداز میں اور کسی نہ کسی نام سے اس ملک میں رائج ہے' آج اس ملک کا ہر فرد اپنے مستقبل کے بارے میں پریشان اور خوفزدہ ہے۔ اور یہی پریشانی اور خوفزدگی اسے حقوق کی جنگ لڑنے پر مجبور کرتی ہے۔ اگر یہاں ہر فرد کو ان کی محنت و صلاحیت کا مکمل پھل ملے اگر کسی کی صلاحیتوں کا استحصال نہ کیا جائے اور کسی کو آگے بڑھنے سے نہ روکا جائے اگر حکمران منہ زور بننے کے بجائے جوابدہی کے جذبات سے مغلوب اور قانون کے دائرے میں رہیں' اگر جھوٹے پندار کے بتوں کی حفاظت کرنے کے بجائے ان کو توڑ دیا جائے تو تمام تر اضطراب ختم ہو سکتا ہے۔ نفرت کی دیواریں گر سکتی ہیں' اور ذہنی فاصلے کم ہو سکتے ہیں' اور معاشرہ دوبارہ اسی خود اعتمادی سے سرشار ہو سکتا ہے جس کے تحت اس نے آج سے ستائیس سال قبل اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔

کسی بھی نظریہ کو آپ خلا اور فضا میں نافذ نہیں کر سکتے بلکہ اس کے لئے ایک علاقے کی ضرورت ہے۔ اسی بناء پر ہمیں بھی اسلامی نظام کے غلبہ و حکمرانی کے لئے ایک علاقہ کی ضرورت ہے جو پاکستان سے بڑھ کر مفید' مناسب اور موزوں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پوری دنیا میں یہ واحد ملک ہے جو نظریہ کی بناء پر معرض وجود میں آیا۔ پھر یہاں ایک نسل موجود ہے جس نے پاکستان کی خاطر لوگوں کو کٹتے اور قربانی دیتے دیکھا ہے اور اسی خطہ کی نوجوان نسل واضح انداز میں اپنی قوتوں اور توانائیوں کو اسلام کے پلڑے میں ڈال چکی ہے' یقین نہ آئے تو اس ملک کے تعلیمی اداروں کا جائزہ لے لیجئے۔ آپکو قریباً ہر اہم تعلیمی ادارے اور یونیورسٹی میں جمعیت ہی کی یونین نظر آئے گی۔ طلبہ کا ہمارے

نمائندوں پر اعتماد کا اظہار کرنا' ان کو انتخابات میں ووٹ دینا' اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس ملک کی نوجوان نسل اسلام کے لئے ہی جینے اور مرنے کی ؟تڑپ اپنے دل میں پیدا کئے ہوئے ہے۔ اگر محض مفادات اور وعدوں کی بنیاد پر ہی طلبہ کو ووٹ دینا ہوں تو پھر ان کی نگاہ انتخاب میں حکمرانوں کے حمایتی طلبہ ہی بچ سکتے ہیں' ہمارے نمائندے نہیں۔ کیونکہ مراعات کی نہر تو ادھر سے ہی بہتی ہے' ادھر تو صرف خلوص ہے' جرات ہے' وعدہ نبھانے کا جذبہ ہے اور اسلام کے لئے محبت ہے۔ پھر یہی وہ خطہ ہے جہاں بڑے منظم اور سائنٹیفک انداز میں دین کے غلبہ کی جدوجہد ہو رہی ہے۔ اس لئے اس خطہ کا بچانا اور اس کی حفاظت کرنا ہر اس فرد کی ذمہ داری ہے جو اپنے بزرگوں کی قربانیوں کو رائیگاں نہیں دیکھ چاہتا' لیکن صاف ظاہر ہے کہ محض نعروں کی بنیاد پر تو اس ملک کو نہیں بچایا جاسکتا' یہ ملک بچ سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جب یہاں کے عوام میں یکسانیت فکر ہو' جب یہاں قانون کو بالادستی نصیب ہو' جب یہاں لوگوں کی عزتیں محفوظ ہوں' جب یہاں کے لوگوں کو تحفظ کا احساس ہو' اور جب لوگوں کو ملک کا نظام چلانے میں شراکت کا بھی احساس ہو۔ یہ چیزیں حاصل نہیں ہو سکتیں جب تک اس ملک میں معاشی' معاشرتی اور سیاسی استحصال سے پاک فلاحی اور اسلامی معاشرہ قائم نہیں کر دیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی جمیت طلبہ ہر قسم کے استحصالی نظام اور استحصالی گروہوں کی بالادستی کی مخالف ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ طلبہ کی ایک تنظیم کو معاشرے کے معاملات میں یوں آگے بڑھ کر رائے دینے اور اثرانداز ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن میرے رفیق عزیز! طلبہ بھی اس معاشرے کا ایک جزو اور اہم حصہ ہیں۔ معاشرہ کی ہر تبدیلی ان پر بھی اثرانداز ہوتی ہے۔ جب تک معاشرہ میں بے چینی ہے' اس وقت تک نوجوانوں کو احساس کی آگ میں جلنا ہی ہو گا۔ معاشرے کا اضطراب نوجوانوں کا اضطراب ہے اور معاشرے کا سکون نوجوانوں کا سکون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم معاشرے کی صورت حال کا جائزہ لینے اور غلط صورت کو تبدیل کرنے پر مجبور ہیں۔ ہم وہ نظام غالب دیکھنا چاہتے ہیں' جس میں انسان تو رہے ایک طرف ایک کتے کے بھوکا مرنے پر بھی خلیفہ کو جوابدہی کا خوف ہو' وہ نظام جہاں ایک بدو کو بھی خلیفہ اور وقت کے حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر یہ کہنے کا حق تو کہ "عمر اگر تم نے کبھی ٹیڑھا ہونے کی کوشش کی تو ہم تلوار سے سیدھا کر دیں گے۔" وہ نظام جہاں حکمران' قوم کے خزانے کو امانت سمجھنے کے بجائے باپ دادا کی جاگیر سمجھتے ہوئے اللوں تللوں میں خرچ نہ کر ڈالیں' جہاں حکمران بھی قانون کے تابع ہوں اور قانون حکمران کے گھر کی لونڈی نہ بن جائے۔ وہ نظام جہاں اقتدار پر فائز ہونا مخصوص گروہ یا خاندان ہی کا حق نہ ہو' بلکہ معاشرہ کا ہر فرد صلاحیت کی بنیاد پر آگے بڑھ سکتا ہو اور اگر ایک چھابڑی لگانے والے کا بیٹا اپنی صلاحیت کے نتیجہ میں وزیر اعظم بن سکتا ہو تو محض غریب کا بیٹا ہونا اس سلسلہ میں اس کے لئے رکاوٹ نہ بنے نہ ہو' ہم وہ نظام لانا چاہتے ہیں جس میں کسی کا قریشی ہونا' کسی کا بلوچ ہونا' کسی کا پٹھان ہونا یا کسی کا راجپوت ہونا باعث شرف نہ ہو' بلکہ باعث شرف صرف تقویٰ ہو' پرہیز گاری ہو' خدا ترسی ہو۔ وہ نظام جس میں وقت کے بڑے بڑے سردار پیچھے دھکیلے جا رہے ہوں۔ اور محض تقویٰ کی بنیاد پر حضرت بلال ؓ کو حبشی اور غلام ہونے کے باوجود صف اول میں جگہ دی جا رہی ہو' بلکہ جس میں بندہ و آقا کی تمیز اٹھ جائے' تفریق مٹ جائے۔ اسلام کی لکیر وجہ امتیاز ٹھہرے جو لکیر سے ادھر وہ غیر اور جو ادھر وہ سب ایک۔ قطع نظر اس سے کہ کون کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے' کون سی زبان بولتا ہے' کون سے رنگ کا مالک ہے اور کس علاقے میں بستا ہے۔ ہم وہ نظام چاہتے ہیں جس میں تعلیمی اداروں کو تجارتی منڈیوں میں تبدیل نہ کیا جائے' جہاں مستقبل کے بارے میں کسی کو عدم تحفظ کا احساس نہ ہو' جہاں کی سیاست میں جھوٹ' دغا' فریب' حقوق غصب کرنے اور منافقت کی روش اختیار کرنے کی قطعاً گنجائش نہ ہو۔ اور جہاں کے متمول لوگوں سے لیا اور مستحق لوگوں میں تقسیم کیا جائے' جہاں مال و دولت کی بے قید دوڑ نہ ہو' جہاں عزت نفس کے مجروح ہوئے بغیر اور پکارنے سے پہلے داد رسی کو پہنچا جائے' جہاں راتوں کو عوام سکون کی نیند سوتے اور حکمران جاگتے نظر آئیں۔ دوسرے لفظوں میں مجھے کہنے دیجئے کہ ہم اس ملک میں محسن انسانیت ﷺ کا نظام غالب دیکھنا چاہتے ہیں جس میں ابو بکر ؓ کی صداقت نظر آئے' جس میں عمر فاروق ؓ کی عدالت نظر آئے' جس میں عثمان غنی ؓ کی حیا اور حضرت علی ؓ کی غیرت اور حمیت اور کراریت کا رنگ جھلکے۔ صرف یہی نظام معاشرے کو سکون فراہم کر سکتا ہے۔ اس قوم نے ستائیس

سال میں مسلسل اس نظریہ سے غداری کا رویہ اختیار کئے رکھا جس کے نتیجہ میں ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا اور اگر اب بھی منافقت و غداری کا رویہ ترک نہ کیا گیا تو اس بچے کھچے ملک کا بھی مستقبل مخدوش ہو جائے گا۔ یہ ملک بچے گا تو صرف اسی نظریہ کے نام پر اور اس سے وفاداری کے نتیجہ میں------!

میرے عزیز ساتھی! اب تک کے خطوط میں بہت حد تک جمعیت کے پروگرامات کی تفصیلات سے آپ کو آگاہ کر چکا ہوں' ان خطوط کا ایک مرتبہ پھر ٹھنڈے دل و دماغ سے مطالعہ کیجئے اور اگر آپ کا دل اس بات کی گواہی دے کہ یہ تنظیم اس ملک کو باقی رکھنے کے لئے ایک اہم ضرورت ہے' اس کا پروگرام اسلامی نظام کے غلبہ کے سلسلہ میں موثر ترین پروگرام ہے' اس کے کارکنان اس اندھیرے ماحول میں سیرت و کردار کے چراغوں کو جلانے کی فکر میں ہیں' اور ان کے سینے اسلام کی خاطر ہر قسم کے زخم کھانے کے لئے کشادہ ہیں۔ تو پھر آگے بڑھئے جمعیت کے دروازے آپ کے لئے کھلے ہیں۔ اس سے پہلے کہ زندگی کی باگیں کھینچ لی جائیں' آیئے معرکہ خیر و شر میں اپنا فرض ادا کر دیں' اگر معاذ و معوذ ایڑیاں اٹھا کر میدان جنگ میں کودنے کے لئے بیتاب دکھائی دے سکتے ہیں تو ہم یہ کام کیوں نہیں کر سکتے؟

آپ کے نام کی مناسبت سے مجھے خالد بن ولید سیف اللہ یاد آ رہے ہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ آپ بھی باطل کی تلوار بننے کے بجائے خدا کی تلوار ثابت ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ اس دور میں اسلامی نظام کیسے اور کب غالب ہو گا؟ لیکن میرا وجدان یہ کہتا ہے کہ اب اسلام اس دھرتی کا مقدر ہو چکا ہے' خوش نصیب ہوں گے وہ افراد جو اسلام کے غلبہ کے سورج کو طلوع ہوتے دیکھ سکیں گے اور اس کی رو پہلی کرنوں کا استقبال کرنے کی سعادت حاصل کریں گے۔

مجھے دور جیل کے اس پار سے یہ صدا ہلکی ہلکی سر میں سنائی دے رہی ہے کہ

جو چل سکو تو چلو کہ راہ وفا بہت مختصر ہوتی ہے
مقام ہے اب نہ کوئی منزل فراز دار و رسن سے پہلے

اور یہ کہ

یہ بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ (آمین)

والسلام

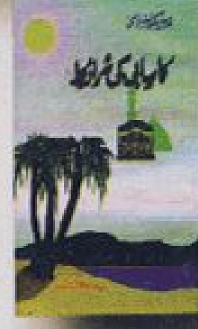
ظفر جمال بلوچ

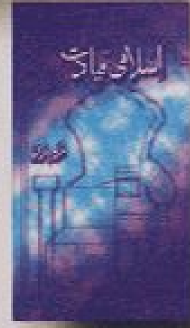


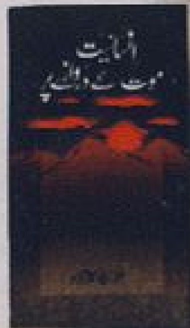

















ادارہ مطبوعات طلبہ

1- اے ذیلدار پارک لاہور